درد کا سفیر
گلوکار
عطاء اللہ عیسیٰ
خیلوی

درد کا سفیر

عطاء اللہ خان عیسیٰ خیلوی

منوّر علی ملک

اشاعتِ اوّل : اگست ۱۹۹۰ء
تعداد : ایک ہزار
طابع : سویرا آرٹ پریس
: ۱۵- سرکلر روڈ، لاہور
قیمت :
ناشر : سرائیکی سُر سنگت، جنرل بس سٹینڈ میانوالی
ملنے کا پتا : سرائیکی سُر سنگت، جنرل بس سٹینڈ، میانوالی
مظہر بکس، ۳۲۵/H، مسلم بازار، میانوالی
نیا ادارہ، ۱۵ سرکلر روڈ، لاہور فون: ۶۱۴۹۷

عطاء کے لختِ جگر

سانول عطاء

کے نام

ترتیب

جواز	۷
وہ محفلیں	۱۳
قطرے سے گہر ہونے تک	۶۵
... سفر جاری ہے	۹۹

جو ساز سے نکلی ہے صدا سب نے سُنی ہے
جو تار پہ گزُری ہے وہ کس دل کو پتا ہے

جواز

"کیا ضرورت ہے مجھ پر کتاب لکھنے کی؟" عطا نے ہنس کر کہا۔

"لوگ تو میرے بارے میں پہلے ہی خود مجھ سے بھی زیادہ جانتے ہیں۔ مثلاً انہیں یہ بھی علم ہے کہ میں اب تک کم از کم چار مرتبہ مر چکا ہوں۔ میرے عشق کی داستان بھی انہیں حرف بہ حرف معلوم ہے۔ ایک صاحب سے یہ بھی سنا کہ عشق کے جرم میں، میں سات سال قید بامشقت بھی کاٹ چکا ہوں۔ جیل سے رہا ہو کر کچھ عرصہ پاگل خانے میں بھی گذارا، اور وہاں سے نکلا تو اپنی محبوبہ کو اغوا کر کے بیرون ملک چلا گیا، اور بقیہ زندگی وہاں بیٹھ کر کیسٹیں ریکارڈ کرواتا رہا۔ غرض میری زندگی کے ایک ایک لمحے کا احوال تو لوگ جانتے ہیں۔ اب تم ہی بتاؤ کہ میرے بارے میں کسی کتاب کی گنجائش ہے؟

"نہ سہی لالا" میں نے ہنس کر جواب دیا "مگر جب اتنے لوگ تمہارے بارے میں جھوٹ بول سکتے ہیں تو میرا بھی کچھ حق بنتا ہے۔ جھوٹ بولنے کا اپنا عمر بھر کا تجربہ تمہارے کام نہ آیا تو اور کس کے کام آئے گا؟"

"تمہارا تجربہ تمہیں مبارک ہو، منور بھائی! تو تم بھی میرے بارے میں جھوٹ ہی بولنا چاہتے ہو؟"

"نہیں لالا! وہ تو میں نے ازراہ مذاق کہہ دیا۔ میں دراصل سچ لکھنا چاہتا ہوں۔"

"سچ؟"

" جی ہاں "

" میرے بارے میں ؟"

" ہاں تمہارے ہی بارے میں ۔"

" دیکھو ' میں منع نہیں کرتا ' مگر سوچ لو ۔ اچھی طرح سوچ لو ! "

" میں سمجھ گیا ' لالا ! یہ درست ہے کہ تمہارے بارے میں سچ لکھنا بہت مشکل ہے کیونکہ

اس میں کچھ پردہ نشینوں کے بھی نام آتے ہیں

اور ان پردہ نشینوں کے لواحقین میری جان کے درپے ہو جائیں گے ' مگر میں بہت بچ بچا کر لکھوں گا ' میری جان ۔ پھر بھی اگ شک و شبہے کی بناء پر بات تھانے کچہری تک جا پہنچی تو ایف آئی آر میں تمہارا نام نہیں آنے دوں گا ۔ کتاب تو میں بہرحال لکھوں گا ۔

چاہے لگ جان ہتھکڑیاں

عطا ہنس دیا ۔ پھر یکلخت سنجیدہ ہو گیا ۔

" اچھا یہ بتاؤ ' کتاب میں اس کا ذکر تو نہیں کرو گے ؟ "

" ہرگز نہیں ' تمہاری مصلحتوں سے زیادہ اس کی مجبوریوں کا لحاظ ہے ۔ "

" ٹھیک ہے ! " عطا نے ایک اداس تبسم کے ساتھ ' آہ بھر کر کہا " اور جو کچھ چاہو لکھ دو ۔ مجھے قطعاً کوئی اعتراض نہ ہو گا ' مگر باتیں سچ سچ لکھنا ' شاعری نہ کرنا ۔ "

ہم نے آخری شرط بھی منظور کر لی اور اللہ کا نام لے کر کتاب لکھنے کا عہد پورا کرنے بیٹھ گئے ۔

سچ لکھنے کی شرط نبھانے کے لئے اس کتاب میں صرف ذاتی تجربات و مشاہدات پر اکتفا کرنا ضروری ہو گیا ۔ اور اسی لئے یہ کتاب روایتی سوانح حیات بننے سے بچ گئی ۔ سچ پوچھئے تو ہم چاہتے بھی یہی تھے ۔

اس کتاب میں عطا کے بارے میں بیشتر سوالوں کے جواب ہی نہیں ' بعض ایسے سوال بھی ہیں جن کے جوابات کی جستجو میں خود عطا بھی قریہ حیرت کی پیچ در پیچ گلیوں میں ایک عرصہ سے سرگرداں ہے ۔ ہر گلی میں بے شمار دروازے ہیں کچھ کھلے ' کچھ نیم وا ' کچھ بند ۔ انہی میں سے کسی ایک دروازے کے اس طرف عطا کے سب سوالوں کے جواب موجود ہیں ۔ مگر تاحال عطا وہ دروازہ دریافت نہیں کر سکا ۔

انداز بیاں کی شوخی بعض سنجیدہ مزاجوں پر گراں گذرے گی ' مگر بہ صد معذرت عرض کروں گا کہ صاحب کیا کروں ' کسی اور طرح لکھنا ہی نہیں آتا ۔ کہتے ہیں نا ' کہ ایک

صاحب نے دوسرے صاحب سے کہا:

"خیریت تو ہے، بھائی جان! آپ کیوں رو رہے ہیں؟"

"رو نہیں رہا ہوں جان من، قدرت نے صورت ہی ایسی بنائی ہے۔" دوسرے صاحب نے آہ بھر کر جواب دیا۔

سو، عرض یہ ہے کہ قدرت نے انداز تحریر ہی ایسا دیا ہے۔ اس میں ہمارا کیا قصور؟ ہمارے علاقے میں جیدن شاہ نامی ایک بزرگ ہوا کرتے تھے۔ پیدائشی مجذوب۔ تقریباً ستر برس کی عمر میں وفات پائی۔ اس وقت تک تو ہوش نہیں سنبھالا تھا۔ مرنے کے بعد کا ہمیں علم نہیں۔

جیدن شاہ کی سب سے منفرد خصوصیت یہ تھی کہ بارات ہوتی یا جنازہ، شاہ صاحب جلوس کے آگے آگے رقص کرتے ہوئے اسے منزل مقصود پر پہنچا کر ہی لوٹتے۔ لوگوں نے بارہا ٹوکا، مارا پیٹا بھی، مگر شاہ صاحب نے بارات اور جنازے کا فرق مان کر نہ دیا۔ کم عقل لوگوں کو کیا معلوم، کہ بعض جنازے بارات اور بعض باراتیں جنازے ہوا کرتی ہیں۔ آپ نے میرے بڑے بھائی ملک انور علی کا جنازہ نہیں دیکھا۔ حد نظر تک آدمی ہی آدمی۔ میں نے زندگی میں انور سے زیادہ حسین دولہا نہیں دیکھا۔ یہ بات میں اس لئے نہیں کہہ رہا ہوں کہ انور میرے بھائی تھے۔ وہ جس کے بھائی بھی ہوتے، ان کا جنازہ اسی شان سے اٹھتا۔ حسن کردار کا نور میت کو بھی دولہا بنا دیتا ہے۔

بات عالم فانی کی سرحد کے اس پار نکل گئی۔ کہنا یہ چاہتا تھا کہ اپنا انداز تحریر جیدن شاہ کی زندگی جیسا ہے۔ ہنسنے اور رقص کرنے کے علاوہ شاہ صاحب کو کوئی اور کام کرتے نہ دیکھا۔ میرے لفظ بھی آپ کو یہی کچھ کرتے نظر آئیں گے۔ لفظوں کا یہ جا بے جا رقص آپ کو ناگوار گذرے تو یہ سوچ کر معاف کر دیجئے گا کہ لکھنے والا بیچارا پاگل ہے۔ اسے کیا معلوم کہ لکھنا کسے کہتے ہیں۔"

لکھنے میں ایک مشکل یہ رہی کہ پانچ چھ سال سے لکھنے کا کاروبار صرف ان تحریروں تک محدود رہا جو ہم پاکستان ٹائمز اور دی نیشن وغیرہ کے لئے لکھتے رہے۔ انگریزی کم بخت میں ایک خوبی یا خامی یہ ہے کہ جسے اس زبان میں لکھنا آجائے وہ کسی اور زبان کے کام کا نہیں رہتا۔ اس زبان کا ایک اپنا مزاج اور مزا ہے۔ لفظ کسی جبر و تشدد کے بغیر اس قدر سلیقے سے اپنی اپنی جگہ سنبھال لیتے ہیں کہ لکھنے والا حیرت سے انہیں دیکھتا رہ جاتا ہے۔

انگریزی کے فضائل بیان کرنے کا مقصد اردو کی تحقیر کرنا نہیں بلکہ اردو پر اپنی گرفت کمزور پڑنے کا سبب بیان کرنا ہے۔ بعض لفظوں کی تکرار اچھی نہ لگی، مگر کوشش

کے باوجود کوئی متبادل لفظ ہاتھ نہ آسکا۔ اردو سے مسلسل بے اعتنائی کی اتنی سزا تو ملنی ہی چاہیئے تھی۔ یہ الگ بات کہ اردو سے بے اعتنائی بلاوجہ نہ تھی۔ اردو لکھنے والوں کی تعداد اتنی زیادہ ہے کہ کسی موثر سفارش اور وسیلے کے بغیر میانوالی جیسے دور افتادہ علاقے کے لکھاریوں کو رسائل و جرائد میں ایک انچ جگہ بھی نہیں مل سکتی۔ ایک آدھ تلخ تجربے کے بعد میں نے اس میدان میں قسمت آزمائی کا خیال ہی دل سے نکال دیا' اور انگریزی میں ایک شوخ سی تحریر کسی سفارش اور وسیلے کے بغیر روزنامہ "پاکستان ٹائمز" کے محمد ادریس صاحب کو بھجوا دی۔ چند روز بعد وہ تحریر بڑے نمایاں انداز میں شائع ہو گئی۔ اس سے میرا حوصلہ بڑھا اور باقاعدگی سے "پاکستان ٹائمز" کے لئے لکھنا شروع کر دیا۔ یہ سلسلہ اب تک جاری ہے۔ "پاکستان ٹائمز" کے میگزین ایڈیٹر سید سرور شاہ صاحب وہاں سے ریٹائر ہو کر "نیشن" میں چلے گئے تو مجھے "نیشن" کے لئے لکھنے کی دعوت دی۔ یوں "نیشن" میں بھی باریابی حاصل ہو گئی۔

"پاکستان ٹائمز" سے وابستگی کا حاصل جناب اقبال جعفری اور محمد سلیم الرحمٰن جیسے اہل علم و قلم احباب سے یاری کا اعزاز ہے۔ میرے بارے میں ان احباب کی رائے سے متاثر ہو کر "پاکستان ٹائمز" کے سابق چیف ایڈیٹر جناب مقبول شریف نے مجھے "پاکستان ٹائمز" کے لئے روزانہ فکاہیہ کالم لکھنے کی دعوت بھی دی۔ مگر میانوالی میں بیٹھ کر لاہور کے اخبار کیلئے لکھنا عملاً ناممکن تھا' اس لئے میں نے معذرت کر لی۔ یہ سب اعزازت اپنی جگہ مگر ہماری بدنصیبی بھی دیکھئے کہ اپنے محسن ادریس صاحب سے ملاقات کا شرف کبھی حاصل نہ ہو سکا۔ ایک آدھ مرتبہ "پاکستان ٹائمز" کے دفتر جانے کا اتفاق ہوا تو ادریس صاحب دفتر میں موجود نہ تھے۔ خیال تھا کہ اس مرتبہ نہ سہی آئندہ کبھی نہ کبھی ملاقات ہو ہی جائے گی۔ مگر ایک دن اچانک معلوم ہوا کہ اب ان سے ملاقات کبھی نہ ہو سکے گی۔

اپنے مطبوعہ انگریزی مضامین کا مجموعہ ڈھائی تین سو صفحے کی کتاب کی شکل میں شائع کرانے کا ارادہ ہوا تو ضمیر نے دو قرض یاد دلا دیئے' جن کی ادائیگی بہرحال واجب تھی۔ ایک قرض عطا کا' دوسرا اردو کا۔ لہٰذا فیصلہ یہ ہوا کہ پہلے یہ قرض ادا کر لوں۔

اس کتاب کے سلسلے میں ایک دلچسپ بات یہ ہے کہ یہ تین طرح سے پہلی کتاب ہے۔ میری پہلی کتاب' عطا پر پہلی کتاب اور میری دانست کی حد تک برصغیر میں کسی گلوکار پر پہلی کتاب۔ تیسری صورت میں یہ پہلی کتاب نہ بھی ہو تو اس قسم کی کتابوں کا سلسلہ جاری رہنا چاہیئے۔ ہمارے نامور گلوکاروں کا یہ حق اہل قلم کے ذمے واجب الادا ہے۔ سیاسی اور غیر سیاسی حکمرانوں پر کتابیں لکھی جا رہی ہیں تو فن کی خدمت کے ذریعے لوگوں

کے دلوں پر حکمرانی کرنے والوں پر کتابیں کیوں نہ لکھی جائیں؟ امانت علی خاں، ملکہ ترنم نور جہاں، جناب مہدی حسن، جناب غلام علی اور بیسیوں دوسرے نامور فن کار ہماری ثقافت کی تاریخ میں عصر حاضر کے بر سر اقتدار لوگ ہیں۔

عطا سے میری محبت میانوالی کے حلقہ احباب میں اکثر چھیڑ چھاڑ کی زد میں آتی رہتی ہے۔ ایسے موقعوں پر میرا جواب یہ ہوتا ہے کہ بے شک عطا سے میری دوستی خاصی پرانی ہے، مگر اتنی پرانی بھی نہیں جتنی آپ لوگ سمجھ رہے ہیں۔ ہمارا تعارف اس وقت ہوا جب ہم دونوں ایک دوسرے کو کچھ لینے دینے کے قابل نہ رہے تھے۔

درد بھری سریلی آوازیں ہمیشہ میری کمزوری رہی ہیں۔ درد بھری والی شرط کی وجہ سے میرے پسندیدہ گلوکاروں کی فہرست بہت مختصر ہے۔ بھارت کے فلمی گلوکاروں میں طلعت محمود، رفیع، مکیش اور لتا جی، پاکستانی پرانے فلمی گلوکاروں میں سائیں اختر، عنایت حسین بھٹی، زبیدہ خانم، مالا۔ موجودہ گلوکاروں میں اخلاق غیر فلمی گلوکاروں میں استاد امانت علی خان اور غلام علی۔ ان کے علاوہ بقیہ سب بڑے بڑے ناموں کا احترام ضرور کرتا ہوں، پسند کی بات الگ ہے۔ لوگ گلوکاروں میں سے سب سے زیادہ عطا کی آواز نے متاثر کیا اور خوش قسمتی سے ایک عرصہ تک اس کا قرب بھی میسر آگیا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب عطا کا تعارف میانوالی میں بھی گنے چنے لوگوں تک محدود تھا، مگر یقین کیجئے میرا دل اس وقت بھی یہ گواہی دیتا تھا کہ یہ آواز اپنے دور کی سب سے منفرد اور موثر آواز ہے لہٰذا یہ آواز کوئی نہ کوئی بلند مقام ضرور حاصل کرے گی۔ بنانے والے نے ایسی آواز صرف چند لوگوں کی سماعت کے لئے نہیں بنائی۔

بے شک دور افتادگی اور بے چارگی کے اس دور میں اس آواز کے وسیع تر تعارف کے وسائل کا نام و نشان تک نہ تھا، مگر دل یہ کہتا تھا کہ وسائل کسی نہ کسی طرح ضرور پیدا ہو جائیں گے۔ اس یقین کی بنیاد اس ایمان پر تھی کہ اس آواز کا بنانے والا وسائل تخلیق کرنے کی قدرت بھی رکھتا ہے۔ اور بالکل یہی ہوا۔ وسائل ہاتھ باندھے عطا کے سامنے آکھڑے ہوئے۔ ان کی تلاش میں عطا کو کسی در پہ دستک نہ دینا پڑی۔ کسی کے آگے دست سوال دراز نہ کرنا پڑا۔

میں نے عطا کا عروج لمحہ بہ لمحہ اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے۔ اور عام لوگوں کے برعکس مجھے اس پر ذرا بھی حیرت نہیں ہوئی، کیونکہ مجھے یقین تھا کہ ایسا ہی ہوگا۔ حیرت ایسا نہ ہونے پر ہوتی۔ عطا صحیح معنوں میں اس مقام کا مستحق تھا جو اس کو نصیب ہوا۔

اس کتاب میں، میں نے عطا کے بارے میں جو کچھ کہا ہے اس پر مبالغہ آمیزی کا شبہ

ان لوگوں کو یقیناً ہو گا جنہوں نے عطا کو قریب سے نہیں دیکھا۔ اس کے برعکس عطا کو قریب سے دیکھنے والے لوگوں کو یہ شکوہ ہو گا کہ بہت سی باتیں لکھنے سے رہ گئیں۔ ان دونوں اعتراضات کے جواب میں' میں صرف اتنا کہوں گا کہ عطا کو میری نظر سے دیکھیں تو آپ کو میرے الفاظ میں نہ مبالغہ نظر آئے گا' نہ تخفیف۔ یہ کتاب عطا کی جو تصویر پیش کرتی ہے وہ ایک انسان کی بنائی ہوئی ہے۔ مگر یہ تصویر جامد نہیں متحرک تصویر ہے۔ کتاب میں عطا آپ کو چلتا پھرتا' زندہ و متحرک نظر آئے گا۔ ایک متحرک تصویر سے کسی انسان کی خوبیوں اور خامیوں کا اندازہ آپ نہ کر سکیں تو قصور آپ کا ہوا' میرا نہیں۔

بہت سی قابل ذکر باتیں اس کتاب میں شامل ہونے سے رہ گئیں۔ ان میں سے کچھ باتیں تو ایسی ہیں جو لکھتے وقت یاد نہ آ سکیں۔ بعد میں یاد آئیں تو اس خیال سے انہیں رہنے دیا کہ یہ خدانخواستہ عطا پر آخری کتاب تو ہے نہیں' لہٰذا انہیں آئندہ کتاب میں شامل کر لیا جائے گا۔ فی الحال اگر انہیں لکھنے بیٹھوں تو نہ صرف اس کتاب کی اشاعت میں کئی ماہ کی تاخیر ہو گی' بلکہ کتاب کی ضخامت بھی ناگوار حد تک بڑھ جائے گی۔ کچھ باتیں دلچسپی کے لحاظ سے قابل ذکر تو تھیں' مگر ان کے ذکر سے کسی نہ کسی دوست کی دل آزاری کا امکان تھا۔ اس لئے انہیں بھی چھوڑنا پڑا۔ تاہم اگر کچھ احباب کا ذکر اس کتاب میں موجود نہ ہو تو بہ صد معذرت ان سے گذارش کروں گا کہ تمام تر قصور میرے حافظے کا ہے اور اس کی تلافی اس کتاب کی آئندہ اشاعت میں ضرور کروں گا۔

عطا کے جن احباب سے تعارف کا اعزاز تاحال میں حاصل نہیں کر سکا' ان سے التماس ہے کہ وہ اپنا مختصر تعارف اور عطا سے دوستی کے حوالے سے قابل ذکر واقعات لکھ کر مجھے بھیج دیں۔ عین ممکن ہے کہ ان خوشگوار یادوں سے ایک اور کتاب مرتب ہو جائے۔

کتاب میں بعض نازک مقامات پر افراد اور جگہوں کے نام احتیاطاً بدل دیئے ہیں۔ تاہم یہ معمولی سا ردوبدل صرف عطا کے معاشقوں کے ضمن میں کیا گیا' بقیہ سب نام اصلی ہیں۔

27/7/05

وہ محفلیں

یہ ہے میکدہ ----

زیرو کے بلب کی سانولی سوگوار روشنی میں ملبوس ایک سادہ سا کمرہ --- فرنیچر سے ناآشنا --- مگر یہاں جو کچھ ہوتا ہے اس کے لئے فرنیچر کی ضرورت ہی کیا ہے۔
ہوتا یہ ہے کہ ہر شام سب سے پہلے ماسٹر وزیر آکر دری کے ایک کونے پر چپ چاپ اکڑوں بیٹھ جاتے ہیں۔ کے ٹو کے سگریٹ کا کڑوا کسیلا دھواں دور ہی سے ان کے وجود کی خبر دیتا ہے۔

ماسٹر وزیر میکدے کی معروف ترین شخصیت ہیں۔ سانولی رنگت ' درمیانہ قد ' دھان پان سا جسم ' چہرے پر شریر سا بھولپن ' جس پر پہلی نظر میں حماقت کا گمان ہوتا ہے۔ مگر اندر سے بڑے سیانے ہیں یہ صاحب۔ عام معاملات میں تو ان کی دانائی اپنی مثال آپ ہے۔ مگر کوئی حسین چہرہ دیکھے ہی اوسان خطا ہو جاتے ہیں۔ اس لئے محفل میں اکثر چھیڑ چھاڑ کا نشانہ بنے رہتے ہیں۔ بالخصوص عطا سے ان کی نوک جھونک بڑی دلچسپ ہوا کرتی ہے۔
ہاں تو! ماسٹر وزیر میکدے میں دری کے ایک کونے پر اکڑوں بیٹھے اپنے مستقبل پر غور کر رہے ہیں۔ ہم وارد ہوتے ہیں۔ "السلام علیکم ' ماسٹر صاحب"
"وعلیکم السلام۔ آ گئے ' ملک صاحب؟"
"لالا (عطا) ابھی نہیں آیا؟"
"آتا ہی ہو گا"

پھر لالا نمودار ہوتا ہے۔ علیک سلیک کے بعد دائیں جانب کے کمرے سے ہارمونیم اٹھا لاتا ہے۔ ہارمونیم دیکھتے ہی ایک عجیب سا سرور ہمارے رگ و پے میں تیر جاتا ہے۔

لالا ہارمونیم پر ہلکے سروں میں کوئی لوک دھن چھیڑ کر آہستہ سے کھنکارتا ہے۔ آغاز سخن عموماً ڈوھڑے سے ہوتا ہے۔ لالا کی گھمبیر پرسوز آواز کمرے میں گونج اٹھتی ہے۔ جوگ کے کرب میں تڑپتے ہوئے یہ بول فضا میں بکھر جاتے ہیں۔

دو دل ٹٹ گئے 'لٹ چمن گیا' تے ھک کوک معشوق دی آئی
کتھے یار کتھوں میں اجڑی دا' میں پھر دیاں وانگ سودائی

"جیویں لالا' جیویں"۔۔۔۔ یہ ماسٹر وزیر کی مخصوص داد تھی۔

اس کے ساتھ ہی لالا کی انگلیاں بجلی کی سی سرعت سے ہارمونیم کے آخری سروں تک جا پہنچتی ہیں اور ڈوھڑے کے یہی بول ایک دردناک چیخ بن کر در و دیوار پر بھی رقت طاری کر دیتے ہیں۔

پہلے مصرعہ میں "گئے" کے لفظ پر پہنچ کر یہ چیخ اتنی طویل ہو جاتی ہے کہ ایک انجانے خوف سے ہمارا دم گھٹنے لگتا ہے اور جب مصرعہ ختم ہوتا ہے تو ہم بے اختیار پکار اٹھتے ہیں "جیو لالا"۔

چچا احسن خان تشریف لاتے ہیں اور سگریٹ سلگا کر چپ چاپ' سر جھکائے ایک کونے میں بیٹھ جاتے ہیں۔ آپ عطا کے قریبی رشتہ دار ہیں۔ موسیقی کے شستہ ذوق' سخن فہمی اور داد کے منفرد انداز کی بناء پر میکدے میں سے نمایاں حیثیت کے حامل ہیں۔

ڈوھڑہ ختم ہوتے ہی لالا اسی دھن میں عدم کا یہ مطلع چھیڑ دیتا ہے۔

جو بھی تیرے فقیر ہوتے ہیں
آدمی بے نظیر ہوتے ہیں

"او جیو عطا اللہ خان'۔۔۔ جیو۔۔۔ ہزاروں سال جیو۔۔۔ ہا"۔

چچا احسن خان اچانک زانو پر ہاتھ مار کر اس قدر جوش و خروش سے یہ نعرہ لگاتے ہیں کہ ہم سہم کر رہ جاتے ہیں۔ اور لالا ایک طویل الاپ کے بعد پھر یہی مطلع دہراتا ہے۔ چچا احسن خان جھوم جھوم کر "جیو عطا اللہ خان" جیو کے نعرے لگا رہے ہیں۔

لیجئے حضرت عقیل عیسیٰ خیلوی بھی آ گئے۔ سر پہ جناح کیپ' آنکھوں پر دبیز شیشے کی عینک' ہاتھ میں ٹارچ' بغل میں بید کی دو میٹر لمبی چھڑی۔ خاصے معقول آدمی دکھائی دیتے ہیں۔ السلام علیکم کہہ کر کمرے کی شمالی دیوار سے لگ کر بیٹھ جاتے ہیں۔

"لالا غزل کا یہ مصرعہ اٹھاتا ہے۔

وہ پرندے جو آنکھ رکھتے ہیں
عتیل عیسیٰ خیلوی چونک کر آہ بھرتے ہیں اور تحت اللفظ اگلا مصرعہ پڑھ دیتے ہیں۔

سب سے پہلے اسیر ہوتے ہیں --- واہ!
غزل ختم ہوتی ہے تو لالا ماسٹر وزیر سے مخاطب ہوتا ہے۔ "ماسٹر!"
"ماسٹر۔ ماجے کو بلاؤ۔"
ملازم حسین عرف ماجا دن میں گورنمنٹ ہائی سکول عیسیٰ خیل میں ملازمت کرتے ہیں اور رات بھر میکدے کی محفل میں طبلہ نوازی فرماتے ہیں۔
عتیل عیسیٰ خیلوی سے ٹارچ اور چھڑی لے کر ماسٹر وزیر ماجے کی تلاش میں نکل جاتے ہیں۔

"سجنڑاں دی خیر۔" یہ آواز نور محمد دیوانہ کی ہے (ہائے کس منہ سے اسے مرحوم کہوں)۔ عمر پچاس کے لگ بھگ آبنوسی رنگت، گٹھا ہوا توانا جسم، بھاری بھرکم گونج دار آواز، شخصیت سراپا خلوص، اس عمر میں عشق تو کیا کرتے ہوں گے، البتہ لالا سے محبت آغاز شباب کے عشق سے بھی دو چار قدم آگے ہے۔ آتے ہی لالا کو ایک فرشی سلام کر کے باادب، باملاحظہ، ہاتھ باندھے ایک طرف بیٹھ جاتے ہیں۔ داد عموماً ماہیئے پر دیتے ہیں۔ انداز سب سے جدا ہے "جیویں" اس ادا سے کہتے ہیں کہ سامعین تڑپ اٹھتے ہیں طبلے کی تھاپ کے ساتھ ان کی تالی ایک سماں باندھ دیتی ہے--- آہ، اب تو دیوانہ کی یاد لالا کے بعض پرانے کیسٹوں میں "جیویں" کی آواز اور تالی کی گونج میں محدود ہو کے رہ گئی ہے۔
ہائے کیا شخص تھا؟ ہر سانس میں پیار کی مہک، ہر لفظ میں محبت کی مٹھاس، ہر لمحہ دوستوں کی خدمت پر کمربستہ۔ کسی تقریب میں جانا ہو تو لالا کا ہارمونیم سر پہ اٹھائے دیوانہ سب سے آگے چل رہا ہے۔ شاید اسی تیز رفتاری کے باعث وہ سب سے آگے نکل گیا۔ دور، بہت دور، --- اب تو نظر بھی نہیں آتا۔

وہ شام کبھی نہ بھلا سکوں گا، جب لالا، میں اور چند دوسرے دوست دیوانہ کو منانے اس کے گھر گئے تھے۔ قصہ یہ تھا کہ دیوانہ نہ جانے کس بات پر ہم سے روٹھ گیا تھا۔ دیوانہ کے بغیر محفل گذشتہ چند راتوں سے کچھ سونی سونی، اداس سی لگتی تھی (آہ! اب یہ محفل ہمیشہ سونی رہے گی)۔
دیوانہ گھر میں موجود تھا۔ ہمیں دیکھ کر اس کی آنکھوں میں آنسو اُمڈ آئے۔ گلوگیر آواز میں کہنے لگا۔

"آؤ سجنو! اس تکلف کی کیا ضرورت تھی۔ تم لوگوں کو تو میں اپنے بچوں کے برابر سمجھتا ہوں۔ اپنے بچوں سے بھلا کوئی کب تک روٹھ سکتا ہے۔ آج نہیں تو کل خود بخود حاضر ہو جاتا"۔

کتنا جھوٹا شخص تھا۔ اب کی بار جو روٹھ کر گیا ہے تو اتنی دور نکل گیا ہے کہ قیامت سے پہلے ملنے کا امکان نہیں۔ کاش! قیامت کے دن دوسری عنایات کے علاوہ قدرت ہماری وہ محفلیں اور ان کے ساتھ نور محمد دیوانہ بھی ہمیں واپس لوٹا دے۔

غم روزگار کے ہاتھوں مجبور ہو کر پہلے لالا نے عیسیٰ خیل کی مستقل سکونت کو خیرباد کہا۔ پھر میرا تبادلہ عیسیٰ خیل سے میانوالی ہو گیا۔ بلکہ سچ پوچھئے تو تبادلہ میں نے خود کرایا۔ میکدہ کی ویرانی اور خم و ساغر کی اداسی دیکھی نہ جاتی تھی۔ محفل درہم برہم ہوئی تو دیوانہ اکیلا رہ گیا۔ تنہائی کہاں تک برداشت کرتا۔ ایک صبح عیسیٰ خیل کے ریلوے سٹیشن پر اپنے کوارٹر میں سب کچھ جوں کا توں چھوڑ کر اپنے خالق کے ہاں جا بسا۔

یہ لیجئے لالا یوسف خان بھی آ گئے۔ آپ نیشنل بنک کی مقامی برانچ کے منیجر ہیں۔ دراز قامت، وجیہہ شخصیت، باتوں میں خلوص کی خوشبو، عادات و اطوار بے حد قلندرانہ، اتنی قلندرانہ کہ ذرا سی بات پر بیس سال کی ملازمت اور چار پانچ ہزار روپے کی تنخواہ پر لعنت بھیجتے، مستعفی ہو کر گھر جا بیٹھے ---- یہ بعد کی بات ہے۔ آج رات آپ حسب معمول بنک ہی سے سیدھے میکدہ پہنچے ہیں۔ لالا یوسف خان ایک خاص انداز میں آنکھیں موند کر ہاتھ لہرالہرا کر، جھوم جھوم کر داد دیتے ہیں۔ لالا کے شیدائیوں میں ان کا نام سرفہرست ہے۔ آندھی ہو یا بارش، ان کی حاضری کبھی خطا نہیں ہوتی۔

قہقہے کی یہ جان دار آواز یقیناً چاچا نیازی کی ہے (بے حس موت، تجھے کیا کہوں۔ کیسے کیسے لوگ تو نے ہم سے چھین لئے)۔

چاچا محمد اسلم خان نیازی ذریعہ معاش کے اعتبار سے ڈرائیور تھے۔ مگر ڈرائیوروں والی کوئی خامی ان کی شخصیت میں کبھی نہ دیکھی۔ نہایت شریف النفس اور وضعدار بزرگ تھے۔ زندہ دل اس قدر کہ عمر کا تفاوت کبھی محسوس ہی نہ ہونے دیا۔ ہر وقت ہنستے ہنساتے رہنا ان کا معمول تھا۔ ایسا بھرپور قہقہہ لگاتے کہ در و دیوار بھی گونج اٹھتے۔

چاچا نیازی تلاش معاش میں سعودی عرب گئے، تو روح وہیں چھوڑ آئے۔ جسم کو ہم نے تابوت میں سجا کر سپرد خاک کر دیا کہ اپنے کام کی چیز تو اب اس میں تھی ہی نہیں۔ لالا کا یہ معروف گیت ان کا محبوب گیت تھا۔

کر کر منتاں یار دیاں آخر آن جوانی ڈھلی

ہائے وہ رات' اگلی صبح چاچانیازی نے سعودی عرب روانہ ہونا تھا۔ ان کی فرمائش پر (کسے معلوم تھا کہ یہ آخری فرمائش ہوگی) اس رات موسیقی کی ایک خصوصی محفل برپا ہوئی۔ اس محفل میں چاچانیازی نے اپنی پسند کے کئی گیت عطا کی آواز میں ریکارڈ کرائے۔ غالباً چار کیسٹ ریکارڈ ہوئے۔ دیار دور افتادہ میں یہی کیسٹ چاچانیازی کی تنہائیوں کے ساتھی رہے۔ محفل برخاست ہوئی تو چاچانیازی بڑے پیار سے ہم سب سے گلے مل کر رخصت ہوئے۔

ہر رات ٹھیک بارہ بجے لالا کے گھر سے چائے آتی۔ قربان جایئے اس ماں کی مامتا کے' جو اپنے لال کا اتنا خیال رکھتی ہے۔۔۔ عارضہ قلب میں مبتلا ہونے کے باوجود امی جان نے میکدے کے رندوں کو رات بارہ بجے کی چائے سے کبھی محروم نہ رکھا۔ عطا کی خانہ آبادی تو ابھی دور کی بات تھی۔ اس لئے چائے' امی اپنے ہی نحیف ہاتھوں سے تیار کرتیں۔ اور چائے بھی پچیس تیس پیالے سے کم کبھی نہ ہوتی۔ آفرین ہے ان کی ہمت پر' اللہ تعالیٰ ان کے شفیق آنچل کا سایہ عطا کے سر پر ہمیشہ قائم رکھے۔

ماں کی شفقتوں سے لبریز چائے کی حدت سے سامعین کے دل پگھل کر یوں موم ہوتے کہ ہر مصرعے پر آہ اور ہر شعر پر واہ کے شور سے میکدے کے در و دیوار گونج اٹھتے۔ اتنی بے پناہ داد پا کر لالا بھی یوں کھل کر گاتا کہ سردیوں کی سرو قامت سیاہ فام رات بھی رقص کرتی دکھائی دیتی۔

ہر رات ٹھیک دو بجے یہ محفل برخاست ہوتی اور لالا ایک دو مخصوص احباب کے ہمراہ کسی پراسرار منزل کی جانب چل دیتا۔ ایک مرتبہ ہم نے بھی ساتھ جانے کی خواہش کا اظہار کیا تو لالا نے ہنس کر کہا" ملک صاحب' آپ شریف آدمی ہیں' آپ ہمارے "وہاں" جا کر کیا کریں گے"۔

اس حوصلہ شکن جواب سے دل برداشتہ ہو کر ہم اپنی شرافت کے گلے میں بانہیں ڈال کر وہیں دری پر لمبی تان کر سو گئے۔

آٹھواں سُر

اونچے سروں کی شاخوں میں الجھ کر جب یہ آواز کسی زخمی پرندے کی طرح پھڑپھڑاتی ہے تو روح کا شجر جڑوں تک لرز اٹھتا ہے۔ اور پھر جب اس بلندی سے کسی زخمی پرندے ہی کی طرح یہ آواز ایک ہچکی کے ساتھ نیچے کو آتی ہے تو ہارمونیم پر عطا کی انگلیوں کی لرزش

رقص بسمل کا منظر بن جاتی ہے۔

یہ آواز وہ آواز ہے جو حلق کی کمان سے تیر کی طرح سنسنا کر نکلتی ہے اور تیر ہی کی طرح دل میں پیوست ہو جاتی ہے۔ بشرطیکہ دل کسی انسان کا ہو۔ اس آواز کو کوئی نام دینا چاہیں تو موسیقی کی لغت کی تنگی داماں کا بھرم کھلتا ہے کہ اتنی موثر اور مقبول آواز کیلئے کوئی لفظ سرے سے موجود ہی نہیں۔ شاید اسی لئے کہ ایسی کوئی آواز پہلے موجود ہی نہ تھی۔ یوں لگتا ہے کہ اس آواز کو تخلیق کر کے قدرت نے سات سروں کی کائنات میں ایک آٹھویں سر کا اضافہ کیا ہے۔ اور اس طرح یہ ثابت کر دیا ہے کہ سروں کا خالق بھی انسان نہیں بلکہ وہ خالق عالم خود ہے۔

موسیقی بلاشبہ ایک فن ہے، مگر اس فن کے ذریعے مقبولیت حاصل کرنے کے لئے شرط فنی مہارت اور تکنیکی داؤ پیچ نہیں بلکہ آواز کا اثر ہے جو سو فیصد ایک خداداد نعمت ہے۔

بڑے سے بڑا ماہر فن بھی اپنی خداداد آواز کو اپنی مرضی کے مطابق نہیں ڈھال سکتا۔ فنی مہارت اور کامیاب گلوکاری میں وہی فرق ہے جو موٹر سازی اور اچھی ڈرائیونگ میں ہے۔ ضروری نہیں کہ ایک اچھا مکینک ایک اچھا ڈرائیور بھی ثابت ہو۔

عطا نے ماہر فن ہونے کا دعویٰ کبھی نہیں کیا، مگر ظلم تو یہ ہے کہ ماہرین فن اسے محض گلوکار ماننے پر بھی آمادہ نہیں۔ وہ تو شکر ہے اللہ کا کہ مقبول گلوکاری کی سند ماہرین فن کی بجائے عوام کے دائرہ اختیار میں ہے، ورنہ پکے راگ کے سوا کوئی غنائیہ کاوش گلوکاری نہ کہلا سکتی۔ موسیقی کے فن میں مہارت اور مقبول گلوکاری کا فرق سمجھ میں آجائے تو آپ یقیناً میری اس رائے سے سو فیصد اتفاق کریں گے کہ مقبولیت کے اعتبار سے یہ توانا آواز ہر جگہ سنائی دیتی ہے۔ اور صرف سنائی ہی نہیں دیتی بلکہ دل کو متاثر بھی کرتی ہے، کیونکہ عطا کی آواز زبان یا الفاظ کی محتاج نہیں۔ سرائیکی اور پنجابی سے قطعاً نابلد لوگ بھی اس آواز کے مداح ہیں۔

کوئی دس سال ہوئے، میرے ایک شناسا نے ایک عجیب واقعہ سنایا۔ یہ صاحب کسب معاش کے سلسلے میں سعودیہ میں مقیم ہیں۔ انہوں نے کہا کہ ایک شام میں اپنا روزمرہ کا کام ختم کر کے اپنے کیمپ واپس جا رہا تھا۔ میرے ہمراہ ہماری فرم کے دو امریکن انجینئر بھی تھے۔ راستے میں ایک جگہ پاکستانی بھائی کے چھپر نما ہوٹل میں عطا کا ایک کیسٹ باآواز بلند بج رہا تھا۔ میرے قدم بے اختیار رک گئے اور میں ماہیے کے دلگداز بولوں میں کھو کر رہ گیا۔ اچانک نظر اٹھا کر دیکھا تو وہ دونوں امریکی انجینئر بھی کھڑے اس آواز پر سر دھن

رہے تھے۔ میں بے حد حیران ہوا کہ میں تو اپنی مادری زبان کے سحر میں گرفتار ہوں مگر ان حضرات پر اس آواز نے یہ کیسا جادو کر دیا۔ ان سے اس محویت کی وجہ پوچھی تو ایک صاحب نے آہ بھر کر کہا:

"This voice makes me feel nostalgic."

یعنی یہ آواز سن کر مجھے گھر کی یاد ستا رہی ہے۔۔۔ اور پھر فوراً ہوٹل میں جا کر انہوں نے منہ مانگے داموں وہ کیسٹ خرید لیا۔

اسی قسم کا ایک واقعہ عطا نے اس زمانے میں بتایا کہ جب وہ اسلام آباد میں مقیم تھا۔ عطا کا کہنا ہے کہ ایک دن میں ایک دوست کے ہمراہ اسلام آباد کے ایک بڑے ہوٹل میں بیٹھا تھا۔ کچھ دور سامنے ایک میز پر ایک غیر ملکی خاتون ایک معمر پاکستانی گائیڈ کے ساتھ بیٹھی ہوئی تھیں۔ اچانک ان کی نظر مجھ پر پڑی اور وہ کچھ دیر ٹکٹکی باندھ کر مسلسل میری طرف دیکھتی رہیں، پھر گائیڈ سے کچھ کہا اور وہ صاحب اٹھ کر ہماری میز کے پاس آئے، اور کہنے لگے۔

"معاف کیجئے گا، کیا آپ عطاء اللہ خان عیسیٰ خیلوی ہیں؟"

"جی ہاں! میں نے کہا، کیا خدمت کروں آپ کی؟"

"شکریہ" انہوں نے کہا "دراصل بات یہ ہے کہ میرے ساتھ جو خاتون بیٹھی ہیں ایک فرانسیسی اخبار کی نامہ نگار ہیں۔ انہوں نے خدا جانے کیسے آپ کو پہچان لیا۔ وہ آپ سے ملنا چاہتی ہیں۔ ہم احتراماً اٹھ کر ان کی میز پر جا بیٹھے۔ خاتون نے انگریزی میں اپنا تعارف کراتے ہوئے بتایا کہ وہ ایک فرانسیسی اخبار سے وابستہ ہیں اور کچھ عرصہ سے پاکستان میں مقیم ہیں۔ یہاں کی جو چیزیں انہیں پسند ہیں ان میں ایک میری آواز بھی ہے۔ ہم ان سے یہ سن کر حیران رہ گئے، کہ ان کے پاس میرے سب کیسٹ موجود ہیں۔ جو بھی نیا کیسٹ بازار میں آتا ہے فی الفور خرید لیتی ہیں۔

ہم نے کہا "محترمہ! کیا آپ ہماری زبان سمجھ لیتی ہیں؟"

کہنے لگیں:

"No I just get the impression but its so lovely..."

عطا کی آواز کے بارے میں ایک حیران کن بات ریڈیو پاکستان ملتان کے سارنگی نواز محمد حسین نے بتائی۔ چند سال قبل وہ عطا کے ہمراہ ایک محفل موسیقی کے سلسلے میں عیسیٰ خیل آئے تو بر سبیل تذکرہ انہوں نے بتایا کہ سارنگی کا سب سے اہم تار چمڑے کا تانت ہوتا ہے۔ مگر عطا کی آواز میں نہ جانے کیا بات ہے کہ چمڑے کا تانت ان کی آواز کا ساتھ نہیں

دے سکتا۔ ایک آدھ مرتبہ ان کے ساتھ سنگت کا اتفاق ہوا تو یہ پتہ چلا کہ چمڑے کے تانت سے وہ تاثر پیدا نہیں ہوتا جو ہونا چاہئے۔ لہٰذا ان کے ساتھ سنگت کے لئے میں سٹیل کا تار استعمال کرتا ہوں اور سٹیل کے تار سے انگلیوں کو زخمی ہونے سے بچانے کے لئے ان پر پلاسٹر ٹیپ لپیٹ لیتا ہوں۔ ریڈیو کی ملازمت کے طفیل میں پاکستان کے ہر بڑے گلوکار کے ساتھ سارنگی پر سنگت کا اعزاز بارہا حاصل کر چکا ہوں اور ہمیشہ چمڑے کا تانت ہی کام دیتا رہا، مگر عطا کی آواز میں خدا جانے کیا بات ہے کہ صرف سٹیل کا تار ہی اس آواز کا ساتھ دے سکتا ہے۔

اکثر لوگ عطا کی آواز کے سوز کو اس کی ذات سے وابستہ سکینڈلز کا عطیہ سمجھتے ہیں۔ میں نہ تو ان سکینڈلز کی تردید کروں گا، نہ ہی آواز پر غم جاناں کے اثر کا منکر ہوں۔ مگر اتنا ضرور کہوں گا کہ عطا کی آواز کا اثر صرف اور صرف عطائے جاناں نہیں بلکہ اس میں اور بھی کئی عناصر شامل ہیں، جن میں سرفہرست تو اللہ کی بے پایاں عنایت ہے۔ اس حقیقت سے کوئی کافر بھی انکار نہیں کر سکے گا کہ آواز اور اس کا اثر انسان کی تخلیق ہرگز نہیں۔ اگر تخلیق کی یہ قدرت انسان کے پاس ہوتی تو آج ہر فرد امانت علی خان، مہدی حسن، غلام علی اور عطا اللہ عیسیٰ خیلوی ہوتا۔ اور خواتین سب کی سب ملکہ ترنم ہوتیں۔ لہٰذا یہ کہنا بے جا نہ ہو گا کہ آواز مہدی حسن کی ہو یا عطا کی اللہ کی ہی دین ہے۔ اور ہر آواز کا ایک مخصوص اثر بھی اسی خالق اکبر کی تخلیق ہے۔ اور یہ کہنا بھی غلط نہ ہو گا کہ ہر مترنم آواز کے اثر کی تربیت کر کے اسے درجہ کمال تک پہنچانے کے لئے مناسب حالات، واقعات، سانحے اور حادثات بھی وہ خود فراہم کرتا ہے۔ یعنی عطا غم جاناں اور غم دوراں کے جتنے بھی صدمات سے گذرا وہ سب کے سب قدرت ہی کے ایک عظیم منصوبے کا حصہ تھے۔

کون انہیں سمجھائے؟

عطا کی بے پناہ مقبولیت سے حسد کرنے والوں کی بھی کمی نہیں اور وہ لوگ موقع بے موقع بظاہر نہایت غیر جانب داری سے عطا کے خلاف زہر اگلتے رہتے ہیں۔ کچھ لوگوں کو یہ کہتے سنا کہ "صاحب" آواز کا کیا ہے۔ کب تک ساتھ دے گی۔ یہی دو چار سال کا عروج ہے پھر زوال ہی زوال۔ آج اس کی شہرت چار سو پھیلی ہوئی ہے، کل کوئی اور اس کی جگہ لے لے گا"۔

ان کرم فرماؤں کو کون یہ سمجھائے کہ حضرات، یہ آواز آپ کی عطا کردہ نہیں بلکہ اس

رب کریم کی عنایت ہے جس کی عنایات پائیداری میں اپنا جواب نہیں رکھتیں ۔ اگر محمد رفیع کی آواز پورے چالیس سال آوازوں کی دنیا پر حکمرانی کر سکتی ہے تو کیا عطا کی آواز کو یہ اعزاز عطا نہیں ہو سکتا؟ دینے والے کے فیصلوں کی آپ کو کیا خبر؟

کچھ حضرات کہتے ہیں "بھئی پتہ نہیں اس شخص نے کیا فراڈ چلا رکھا ہے" کہ جہاں جاؤ اسی کی آواز کان میں پڑتی ہے ۔ جہاں بیٹھو اسی کے تذکرے چھڑے ہیں ۔ سر نہ ساز' پوری قوم کو الو بنا رکھا ہے ۔۔۔ اس کے مقابلے میں اپنے چھجو میاں کو دیکھئے ۔ گلے میں رس 'سا' رے' گا پر مکمل عبور' مرکیاں 'گمک' 'تان' پلٹے سب کچھ ازبر 'شکل و صورت میں کون سے فلمی ہیرو سے کم ہیں ۔ ریڈیو 'ٹی وی پر برابر دس سال سے گا رہے ہیں 'مگر انہیں کوئی گھاس تک نہیں ڈالتا ۔ کسی گھر میں ان کا ایک بھی کیسٹ آج تک دیکھنے میں نہیں آیا ۔ اوپر نیچے چار کیسٹ تو پچھلے مہینے مارکیٹ میں آئے تھے ۔ مگر میوزک سینٹروں والے کہتے ہیں قسم لے لو جو دس کیسٹ بھی بکے ہوں ۔۔۔ آخر ہماری قوم کو ہو کیا گیا ہے؟ سمجھ میں نہیں آتا کہ عطاء اللہ نے لوگوں پر کیسا جادو کر دیا ہے ۔ کون سی دکھتی رگ پکڑ رکھی ہے ان کی ۔۔۔ ایسی کون سی انوکھی بات ہے اس کی گلوکاری میں ....؟

کوئی اور انوکھی بات عطا کی گلوکاری میں ہو نہ ہو ۔ یہی کیا کم ہے کہ یہ صاحب حلقہ یاراں میں گرج برس کر جب گھر جاتے ہیں تو گھر میں قدم رکھتے ہی عطا کی آواز کان میں پڑتی ہے ۔

اے نتھلی ' نک دی نتھلی

تیڈی وینٹی ہے گوری پتلی ۔ تے ونگاں نالے چھنکدیاں

اور ان کے بیوی بچے ٹیپ ریکارڈ کے گرد گھیرا باندھے نہایت انہماک سے عطا کی آواز سن رہے ہوتے ہیں ۔

عطا کی آواز وہ آواز ہے جس کے اثر کو گاما پادھانی کے پیمانے سے نہیں ملایا جا سکتا ۔ اس کی بے پناہ مقبولیت بلاوجہ نہیں ہے ۔ یہ آواز وہ اکلوتی آواز ہے جو ہر غم زدہ دل میں تیر کی طرح اترتی ہے اور خون میں سرایت کر کے پورے وجود میں تیرتی ہوئی انسان کے اندرونی زخموں کو کچھ اس طرح کریدتی ہے کہ تمام کرب اور اذیت' دکھ اور درد یا تو اشکوں میں ڈھل کر آنکھوں کے راستے زائل ہو جاتا ہے' یا پھر ایک کیف اور غبار بن کر درد سے چٹختے اعصاب کو سکون کی نیند سلا دیتی ہے ۔ زخم جواں سال بیٹے کی جدائی کا ہو' یا ماں باپ سے ہمیشہ کے لئے بچھڑنے کا' دکھ محبوب کی بے وقت موت کا ہو یا وطن سے دوری کا ۔ رنج کسی ضعیف العمر انسان کو اپنی بے بسی کا ہو یا کسی بچے کو اپنا کھلونا ٹوٹنے کا' عطا کی آواز ہر زخم' ہر دکھ

اور ہر رنج سے ہم کلام ہوتی ہے۔

ساز

اساتذۂ فن کی نظر میں ہارمونیم ایک نہایت گھٹیا ساز ہے۔ آج سے کچھ عرصہ قبل ریڈیو کے ارباب اختیار ریڈیو پر ہارمونیم کے ساتھ گانے کی اجازت نہیں دیتے تھے۔ یہی ہارمونیم کبھی عطا کو بجاتا سنیے تو آپ دنگ رہ جائیں گے۔ عام گلوکاروں کی طرح وہ محض مقررہ سروں پر انگلیاں پھیر کر رسم پوری نہیں کرتا' بلکہ اپنے گیت' ڈوھڑے یا ماہیے کا ایک ایک لفظ ان سروں سے کشید کرتا ہے۔ اور گیت یا ماہیے کے ہر مصرعے کے آخر میں ہارمونیم کا ایک ایسا انوکھا ٹچ دیتا ہے کہ بول کا المیہ یا طربیہ تاثر شعور کی جھیل میں چاند کی طرح اتر جاتا ہے۔

سرائیکی اور اردو زبان کی شیرینی اپنی جگہ' مگر سروں میں ڈھل کر' بالخصوص اونچے سروں میں گانے کے دوران تلفظ گلوکار کی گرفت سے پھسلنے لگتا ہے اور لہجے میں ایک ناگوار سی کرختگی در آتی ہے۔ عطا نے مسلسل محنت سے ایک ایسا لہجہ اپنا لیا ہے جس میں شیرینی اور اداسی کا ایک حسین امتزاج سننے والوں کو اپنی روح میں گھلتا محسوس ہوتا ہے۔

اندازِ بیاں اور

اردو میں سرائیکی اور سرائیکی میں اردو کا پیوند لگانے کی بدعت بھی عطاء ہی کی ایجاد ہے۔ اور یہ بدعت بھی اس کی مقبولیت کا ایک بڑا سبب ہے۔ فیض کے کلام میں آڈھے خان کا ڈوھڑہ وہ اس طرح ملاتا ہے کہ تھل کے ان پڑھ دہقان پر بھی فیض کے شعر کا مفہوم پوری طرح واضح ہو جاتا ہے۔ اسی طرح یونس خان کے سرائیکی گیت میں وہ جگر مراد آبادی کا شعر اس لئے شامل کر دیتا ہے کہ سرائیکی نہ سمجھ سکنے والے اہل ذوق بھی یونس خان کی بات بخوبی سمجھ لیتے ہیں۔

جوگ' بھیرویں' پہاڑی اور سندھڑا وغیرہ میں ڈوھڑا اور ماہیا گانے کا انداز جو عطا کا ہے کسی اور کا نہیں۔ اس منفرد اور دلکش انداز کی نقل اگر کوئی کر بھی لے تو عطا ہی کا خوشہ چین کہلائے گا۔

عطا کو ایک بڑا گلوکار مانیں یا نہ مانیں اس کا یہی کمال کیا کم ہے کہ اس نے ہلکی پھلکی

موسیقی کو اس وقت سنبھالا دیا جب لوگ بے ہنگم، فحش اور کرخت فلمی گیتوں سے بیزار ہو کر گیت کے نام سے کوئی چیز سننے کو آمادہ ہی نہیں ہوتے تھے۔ گلوکاروں نے جب سامعین کے چہروں پر بیزاری کے تیور دیکھے تو ان کی توجہ حاصل کرنے کے لئے گانے کے ساتھ ساتھ بھونڈے انداز میں ناچنا اور تھرکنا بھی شروع کر دیا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ مظلوم عوام نے فلموں، ٹیلی وژن اور ریڈیو کی راہ سے ہلکی پھلکی موسیقی کے عنوان سے پھیلتے تعفن کو قبول کرنے سے صاف انکار کر دیا۔ شرفاء نے فلمیں دیکھنا چھوڑ دیا۔ فلمی گانوں کی موسلا دھار بارش کے خوف سے ریڈیو کا سوئچ صرف خبریں سننے کے لئے آن (On) کیا جاتا، اور خبریں ختم ہوتے ہی لاحول پڑھ کر فی الفور بند کر دیا جاتا۔

یہ تھی ہلکی پھلکی موسیقی کی قدر و قیمت جب عطا اس میدان میں وارد ہوا۔ مگر آپ نے دیکھا کہ وہ آتے ہی نہ صرف سب کا منظور نظر بن گیا بلکہ بے شما لوگ گلوکاروں اور گیت نگاروں پر بھی شہرت اور مقبولیت کے دروازے وا کر دئے۔ لوک گلوکاری کو جو عروج عطا کے آنے سے حاصل ہوا اس کی مثال موسیقی کی تاریخ میں کہیں نظر نہیں آتی۔ منصور علی ملنگی، طالب حسین درد، بشیر احمد، اللہ دتہ لونے والا، محمد حسین بندیالوی، احمد خان ملنگ، شفیع اختر دتہ خیلوی ایوب نیازی، لیاقت علی خان عبدالستار زخمی وغیرہ نے ملتان، جھنگ، بہاولپور، ساہیوال، ڈیرہ غازی خان، ڈیرہ اسماعیل خان، مظفر گڑھ، میانوالی، اٹک، سرگودھا، خوشاب، چکوال، راولپنڈی اور جہلم کے علاقوں میں بے پناہ مقبولیت حاصل کی۔ ڈوھڑے کی صنف میں ریاض، اقبال، تاج یاسین، آڈھا خان، بے وس وغیرہ نے نہایت خوبصورت شاعری تخلیق کی، سینکڑوں گیت نگار منظرعام پر آئے، اور اس طرح عطا کے دم سے مقبول موسیقی کی ایک رنگا رنگ دنیا آباد ہو گئی جس میں،

جو ذرہ جس جگہ ہے وہیں آفتاب ہے

لوک گلو گاروں کی روز بروز بڑھتی ہوئی مقبولیت کو دیکھ کر ٹیلی ویژن کے ارباب اختیار بھی ان لوگوں کی اہمیت کو تسلیم کرنے پر مجبور ہو گئے اور ان کے خصوصی شو نشر ہونے لگے۔ عوام کے مزاج شناس، ان کے دکھوں کے ترجمان، ان کی خوشیوں کو دوبالا کرنے والے فن کار جنہیں محض ان کی غریبی کی وجہ سے ٹیلی ویژن سٹیشنوں کے قریب سے گزرنے کی بھی اجازت نہ تھی، اب انہیں گھروں سے بلا کر ٹیلی ویژن پر اپنے فن کا مظاہرہ کرنے کی دعوتیں دی جانے لگیں لوک گلوکاری کی مقبولیت نے محمد علی شہکی جیسے فیشن ایبل پاپ سنگر کو بھی علن فقیر جیسے بوریہ نشین لوک گلوکار کے ساتھ مل کر لوک رنگ میں گیت گانے پر آمادہ کر لیا۔۔۔۔ آپ خود ہی انصاف کیجئے کہ لوک گلوکاری

کی اس مقبولیت کا سہرا کس کے سر ہے ؟ ------ بے شک لوک موسیقی کی نوک پلک سنوارنے میں اور لوگوں نے قابل قدر کردار ادا کیا ہے۔ بہت بڑے بڑے نام اس شعبے سے وابستہ ہیں ۔ یہاں یہ نام اس ڈر سے درج نہیں کرتا کہ اگر کوئی نام سہواً رہ گیا تو اس نام کے پرستاروں کی گالیاں سننا پڑیں گی ۔ لہٰذا یہ کہوں گا کہ لوک موسیقی کے میدان میں بڑے بڑے باکمال لوگ موجود ہیں مگر لوک موسیقی کو مقبول خاص و عام بنانے کا کمال عطا کی آواز نے دکھایا۔

دل نے بہت درد سہے

فن کی خاطر مصائب تو ہر فن کار برداشت کرتا ہے مگر حوصلہ شکنی اور بے قدری کے جن تلخ تجربوں سے عطا گزرا ہے ان کا تصور ہی لرزہ خیز ہے ۔ فن سے محبت کے جرم کی پاداش میں اس کو کیا کیا سزائیں نہ دی گئیں ۔ وہ کراچی میں فٹ پاتھوں پر سویا ' لاہور کے ہوٹلوں میں لازمت کی ' فیصل آباد میں رکشاڈرائیوری کی ' مگر فن کا دامن ہاتھ سے نہ جانے دیا ------ ایک دفعہ اس کے ہمراہ فیصل آباد کے ایک بازار سے گزر ہوا تو عطا نے ایک بوسیدہ سی عمارت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا

" لالا آج سے دس برس پہلے میں اس عمارت کے ایک تنگ و تاریک کمرے میں مقیم تھا۔ "

" وہ کس جرم میں ؟ " میں نے پوچھا

عطا کی آواز بھرا گئی کہنے لگا " یہاں حبیب بنک میں ایک کلرک کی اسامی کے لئے درخواست دے رکھی تھی ۔ میں تیس روپے ماہوار کرایہ پر اس کی ٹھڑی میں رہتا تھا۔ دن بھر رکشا چلا کر کھانے پینے اور کرائے کا خرچ پورا کرتا رہا۔ تین ماہ کے مسلسل انتظار کے باوجود ملازمت نہ مل سکی ۔ "

" اچھا؟ تو پھر کیا ہوا۔ "

" پھر یہ ہوا کہ میرے گھر والوں کو میرے ٹھکانے کا پتہ چل گیا ' اور والد صاحب یہاں آکر مجھے اپنے ہمراہ گھر لے گئے ۔ "

اللہ کی شان دیکھئے کہ آج اسی فیصل آباد میں جہاں عطا کو کلرک کی جگہ نہ مل سکی ۔ جہاں وہ پرائے رکشے پر مزدوری کرتا رہا عطا جب اپنی لمبی چوڑی قیمتی گاڑی کہیں روکتا ہے تو لوگ پروانوں کی طرح اس کے گرد جمع ہو جاتے ہیں۔

عیسیٰ خیل جیسی سنسان جگہ پر جسے تہذیبی اعتبار سے ایک دور افتادہ جزیرہ کہنا زیادہ مناسب ہو گا، محض اپنے ذوق کو زندہ رکھنا ہی کچھ کم کمال نہیں ـــــ تربیت اور رہنمائی تو دور کی بات ہے، حوصلہ افزائی کی توفیق بھی کسی کو نصیب نہیں ۔ پس ماندگی اور بے سروسامانی کے احساس میں مبتلا لوگ یہ تصور ہی نہیں کر سکتے کہ عزم اور محنت کی مدد سے کوئی شخص کسی میدان میں درجہ کمال کو پہنچ سکتا ہے ۔ لہٰذا اگر کوئی باہمت انسان آگے بڑھنے کے ارادے کا اظہار بھی کرے تو اس کا مذاق اڑایا جاتا ہے۔ اسے خبطی اور پاگل کہا جاتا ہے ۔ عطا کو بھی یہ سب کچھ کہا گیا۔ اس کی محنت کو وقت کا ضیاع اور اس کے شوق کو تساہل پسندی قرار دیا گیا۔ اس کی جستجو کو آوارگی اور جدوجہد کو حماقت کا نام دیا گیا۔ مگر عطا اپنی منزل متعین کر چکا تھا۔ اور سفر کے لئے زادِراہ ـــ شوق، صلاحیت، محنت کی عادت اور راستے کی رکاوٹوں کو خاطر میں نہ لانے کی ہمت ـــ سے قدرت نے اسے اس حد تک نوازا تھا کہ وہ کسی کی حوصلہ افزائی کا محتاج، سرپرستی کا دست نگر اور رہنمائی کا حاجت مند نہ تھا ـــ نہ ستائش کی تمنا نہ صلے کی پروا۔

وہ اللہ کے بھروسے اور اپنی قوت ارادی کے بل بوتے پر مسلسل آگے بڑھتا رہا۔ سفر مشکل بھی تھا اور طویل بھی ـــ اندازہ کیجئے کہ عطا نے تقریباً بارہ سال ایک تنگ و تاریک کمرے میں بیٹھ کر اپنے فن کی تہذیب و تربیت کی ۔ اپنی آواز پر محنت کی اور اپنا ایک مخصوص انداز وضع کیا۔ بارہ سال کے اس طویل بامشقت دور میں اس کا تعارف اس تنگ و تاریک کمرے کی چاردیواری تک محدود رہا۔ اس کے فن کے قدر دان اور اس کی محنت کی داد دینے والے اسی جیسے چند تہی دست بے سروسامان اور گمنام نوجوان تھے جو "جیو لالا" کہہ کر داد دینے کے علاوہ اس کی کچھ اور مدد کرنے کی استطاعت سے محروم تھے ـــ عطا کی قناعت دیکھئے کہ وہ "جیو لالا" کی اس بے ساختہ صدا ہی کو اپنے لئے سب سے بڑا اعزاز سمجھتا تھا۔ محفل میں اگر کوئی دوست کسی ذاتی پریشانی کی وجہ سے خاموش نظر آتا تو عطا اس سے "جیو لالا" کہلوا کر ہی دم لیتا۔

ایک رات شدید سردی اور بارش کی وجہ سے میرے سوا کوئی بھی دوست میکدے میں حاضر نہ ہو سکا۔ عطا نے معمول کے مطابق گانا شروع کیا۔ میں خدا جانے کس عالم میں کھویا ہوا تھا کہ سر جھکائے چپ چاپ بیٹھا رہا۔ عطا کو میری خلاف معمول خاموشی اچھی نہ لگی ۔ میری پسند کا ماہیا

گل ساڈے اجڑن دی کدی ماہی وی سن باہسی

اونچے سروں میں الاپ کر دیکھا۔ کچھ اثر نہ ہوا۔ ایک بار پھر یہ ماہیا نئے انداز میں

پیش کیا' مگر ہماری توجہ ہمارے پاس ہوتی تو ادھر صرف کرتے۔ عطا نے تڑاخ سے ہار مونیم بند کیا اور منہ پھلا کر بیٹھ گیا۔ اچانک خاموشی نے ہمیں جھنجھوڑ کر چونکا دیا۔

"کیوں لالا' کیا بات ہے؟" ہم نے بڑے تعجب سے پوچھا "گانا کیوں بند کر دیا؟"

"دیکھو لالا" عطا نے بڑے دکھ بھرے لہجے میں کہا "تم جانتے ہو کہ میں کسی صلے یا انعام کے لئے نہیں گاتا۔ صرف تم لوگوں کی خوشی کے لئے گاتا ہوں۔۔۔ اس لئے میری یہ گذارش بے جا نہ ہوگی کہ یا تو یہاں آنا ہی چھوڑ دو' یا پھر پوری توجہ سے مجھے سنا کرو اور مجھے یہ احساس ضرور دلاتے رہا کرو کہ میری محنت فضول اور بے اثر نہیں۔ بلکہ کار آمد اور مؤثر ہے"

"جیو لالا" ہم نے دل کی گہرائیوں سے نعرہ لگایا اور عطا نے مسکرا کر کھٹاک سے ہارمونیم کی چٹخنی کھولی اور پانچویں کالے سر سے جوگ میں وہی ماہیا ہماری نذر کر کے گانا دوبارہ شروع کر دیا۔

تقریبات میں عطا کو گاتے دیکھیں تو کئی ایسی باتیں سامنے آتی ہیں جو اسے دوسرے فن کاروں سے ممتاز کرتی ہیں۔ ایک تو اس کی بے پناہ خود اعتمادی ہے۔ مجمع جتنا بھی بڑا ہو' جس قبیل کا بھی عطا پر گھبراہٹ کبھی طاری نہیں ہوتی۔۔۔ خالص اہل ذوق کی مجلس ہو یا سینما ہال میں اگلی نشستوں پر بیٹھنے والی ستم ظریف مخلوق کا اجتماع' عطا کے لئے اپنے فن کا مظاہرہ کرنا کبھی مسئلہ نہیں بنا۔ بظاہر ہارمونیم کے سروں سے کھیلتی ہوئی اس کی انگلیاں محفل کے ہر فرد کو اپنی نبض پر رکھی محسوس ہوتی ہیں' اس کے گیتوں کی لے اپنی رگوں میں دوڑتی محسوس ہوتی ہے' اور اس کی آواز کا اتار چڑھاؤ دلوں کے دھڑکنے کی رفتار متعین کرتا ہے۔

نغمہ سرائی کے دوران محفل کو ہمہ تن متوجہ رکھنے کے لئے عطا اشعار کے علاوہ بعض اوقات ایک آدھ خوبصورت جملہ نشانے پر پھینک کر سب کی توجہ حاصل کر لیتا ہے۔ اور یوں اپنی بے نظیر گلوکاری کے علاوہ اپنی حاضر جوابی اور برجستہ گوئی کی داد بھی سامعین پر قرض نہیں رہنے دیتا۔

میکدہ

میکدہ کا ذکر اس داستان میں بار بار ہوا ہے۔ اس ذکر سے آپ کا یہ اندازہ تو درست ہے کہ میکدہ وہ کمرہ تھا' جہاں ہر رات ہماری محفل برپا ہوتی تھی۔ مگر یہ سراسر غلط ہوگا کہ وہاں اور

کرتوتوں کے علاوہ پینے پلانے کا کاروبار بھی ہوتا ہوگا۔ جی نہیں، میکدہ کی وجہ تسمیہ مے خواری نہیں بلکہ صرف خواری تھی۔ غم جاناں اور غم دوراں کا حاصل خواری، جس سے پناہ لینے کے لئے ہم لوگ سرشام ہی وہاں جمع ہو جاتے تھے۔ اور سروں نے کشید کی ہوئی مے سے غم غلط کرتے تھے۔

میکدہ ایک وسیع و عریض چاردیواری سے گھرے ہوئے تین کمروں کی قطار میں درمیانی کمرہ تھا۔ اس کے بائیں جانب والے چھوٹے سے پر اسرار کمرے میں عطا کے ایک دو قریب ترین احباب کے سوا کسی اور کو داخل ہونے کی اجازت نہ تھی۔ اس کمرے کی آرائش عطا کی نفاست طبع اور خوش ذوقی کا منہ بولتا ثبوت تھی۔ کمرے میں حسب ضرورت فرنیچر اور زیبائشی چیزوں کے علاوہ عطا کا ہارمونیم، ہر رات کی محفل کے ریکارڈ شدہ کیسٹ اور کبھی کبھار ساقی گیری کے چند لوازمات سلیقے سے رکھے ملتے تھے۔ اس زمانے میں عطا کو

شوق پینے کا اتنا زیادہ نہ تھا

بلکہ ایک زمانہ ایسا بھی آیا کہ اس نے پینا بالکل ہی چھوڑ دیا۔ اور اگر وہ عیسیٰ خیل ہی میں رہتا تو

ترک توبہ کا کوئی ارادہ نہ تھا

مگر عیسیٰ خیل کے خشک اور بے ذائقہ ماحول سے نکل کر چراغ خانہ سے شمع انجمن بنا تو بعض مخلص اور خیر خواہ دوستوں کے فیض صحبت سے پینا پلانا معمول بن گیا۔ اور وہ مخلص اور خیر خواہ احباب بھی فائدے میں رہے کہ ان کا پینے پلانے کا خرچ عطا کی حبیب سے بر آمد ہونے لگا۔

اللہ کا خصوصی کرم ہے کہ ایک طویل عرصہ تک عطا کی صحبت میں رہنے کے باوجود پینے پلانے کے معاملے میں ہم زاہد خشک ہی رہے۔ ایک دفعہ میکدے میں میں، عطا اور ان کے میانوالی سے آئے ہوئے دوست یونس خان شام کا کھانا کھا رہے تھے۔ یونس خان ولایتی وہسکی کی دو قد آور بوتلیں ہمراہ لائے تھے۔ دستر خوان پر اور چیزوں کے علاوہ دو گلاس وہسکی کے اور ایک سادہ پانی کا بھی رکھا تھا۔ ازراہ شرارت ہم نے وہسکی کے گلاس کی طرف ہاتھ بڑھایا تو عطا نے فوراً جھپٹ کر گلاس ہمارے ہاتھ سے چھین لیا۔ کہنے لگا۔

"لالا" ہم تو پینے کی ذلت آمیز عادت میں مبتلا ہیں، مگر تم ایک استاد ہو۔ تمہیں اس گھٹیا چیز کو ہاتھ لگانا ہرگز زیب نہیں دیتا۔"

اسی قسم کا ایک واقعہ حال ہی میں ایک تقریب کے موقع پر میانوالی میں ہوا۔۔۔

تقریب سے کچھ دیر پہلے بوتل کھلی کمرے میں موجود بیشتر احباب کے چہروں پر رونق آگئی۔ ایک صاحب نے عطا سے کہا "آج ملک کو بھی پلاؤ --- کیا یاد کرے گا کہ ساری عمر رندوں میں کٹ گئی، مگر ---"

رہنے دو --- یہ نہیں پیتا۔" عطا نے ان صاحب کو ڈانٹ دیا۔

"مگر کیوں نہیں پیتا؟" ان صاحب نے شوخی سے کہا۔

"اسی لئے تو ہم اس شخص کا احترام کرتے ہیں" جناب فاروق روکھڑی نے منہ توڑ جواب دیا۔

بات میکدے کی ہو رہی تھی۔ کیوں نہ آپ کو وہیں لے چلوں، تاکہ آپ کو میکدہ اور اہل میکدہ کے بارے میں مزید کچھ جاننے کے لئے کسی اور واقف حال کی خدمات حاصل نہ کرنا پڑیں۔

آج کچھ درد مرے دل میں ---

آندھی ہو یا طوفان، کڑاکے کی سردی ہو یا غضب کی گرمی، میکدہ ہر شام آٹھ بجے آباد ہو جاتا۔ اور یہ آبادی صبح دو بجے تک بلاناغہ برقرار رہتی --- دسمبر کی طویل، یخ بستہ راتوں کے پچھلے پہر جوگ کے سوگوار سروں میں یہ ماہیا فضا میں لہراتا

پانی پیون ڈے
وسدیاں نیٹو بھاندا ہن اجڑ کے جیون ڈے

تو تمام کائنات سیاہ لبادے میں، بال بکھرائے ٹوٹی قبر پر بیٹھی حسینہ کی طرح کرب سے کوکتی سنائی دیتی --- یہ جگر گداز ماہیا شکیب جلالی مرحوم کے اس شعر کا کس قدر خوبصورت ترجمہ ہے:

تو نے کہا نہ تھا کہ میں کشتی پہ بار ہوں
آنکھوں کو اب نہ ڈھانپ مجھے ڈوبتے بھی دیکھ

بلکہ ترجمہ کہنا بھی سوفی صد درست نہ ہوگا۔ اس ماہیے میں بات زیادہ درد انگیز انداز میں کہی گئی ہے۔

دسمبر کی وہ ناقابل فراموش رات جب کوئی بارہ بجے تک انتہائی اونچے سروں میں ماھیا سرائی کرتے کرتے عطا اچانک ایک چیخ مار کر ہارمونیم پر ڈھیر ہوگیا --- جسم شل، اکھڑتے سانس، ڈوبتی نبضیں --- موقع پر صرف میں اور ماسٹر وزیر موجود تھے --- شدید

سردی اور چھاجوں برستی بارش کی پروانہ کرتے ہوئے ہم دونوں سرپٹ بھاگے۔ ایک ڈسپنسر دوست (لالہ شنو) کے گھر پہنچے۔۔۔ ہانپتے' کانپتے' ہکلاتے ہوئے اسے اپنی بے وقت آمد کا سبب بتلایا اور اسے ہمراہ لے کر واپس میکدے میں آئے تو عطا کی بے ہوشی مایوس کن صورت اختیار کر چکی تھی۔ اس کی حالت دیکھ کر کلیجہ منہ کو آتا تھا۔۔۔ ڈسپنسر دوست نے عطا کی نبض پر ہاتھ رکھ کر نفی میں سرہلایا تو ہم دونوں بے اختیار چیخ اٹھے "اے رب کریم' ہمارا لالا ہم سے نہ چھین۔۔۔ تو جانتا ہے کہ اس شخص کا وجود غمزدہ دلوں کے لئے کتنا بڑا سہارا ہے۔

رب رحیم کی رحمت رات کے پچھلے پہریوں بھی جوش میں ہوتی ہے۔ ہماری بے ساختہ التجا کام کر گئی۔ دعا کا جواب فوراً آیا۔ عطا نے ایک 'جھرجھری سی لی اور آنکھیں کھول دیں۔ چند ہی منٹ بعد وہ یوں اٹھ کر بیٹھ گیا جیسے کچھ ہوا ہی نہ تھا۔۔۔ تشکر اور اطمینان کا سانس تو ہم نے لیا۔ مگر ایک ان جانے خوف کی وجہ سے رات بھر عطا کو دوبارہ ہارمونیم کے قریب نہ جانے دیا۔۔۔ یہ جبری پرھیز مگر کب تک کرواتے۔۔۔ اگلی رات یہ حضرت پہلے سے بھی زیادہ اونچے سروں میں اپنی حسرتوں کا ماتم کر رہے تھے۔ اور ہم ہر مصرعے پر جیو لالا کے نعرے لگا رہے تھے۔

سکوت سخن شناس عطا کسی بھی صورت میں برداشت نہیں کر سکتا۔ میکدے کی محفلوں میں اگر کبھی کوئی دوست خلاف معمول چپ چاپ اور پریشان دکھائی دیتا' تو عطا فوراً ایک آدھ ماہیا یا شعر اس کی نذر کر کے اسے متوجہ کر لیتا۔ اسے ہر دوست کی پسند ناپسند کا علم تھا۔ اور اسی کے حوالے سے وہ ہر دوست کی فرمائش بن کے پوری کر دیتا تھا۔ مثلاً مجھے متوجہ کرنے کے لئے وہ یہ ماہیا ضرور سناتا۔۔

وکن املوک آیا
انج برباد کیتی ساکوں ڈیکھن لوک آیا

ماسٹر وزیر سے بھرپور داد اس ماہیے پر ملتی

قد ماہیے دا چھوٹا اے
کالیاں زلفاں دے وچہ مکھ چن دا ٹوٹا اے

چاچا احسن خان صاحب سے خراج تحسین اس شعر پر وصول ہوتا:

زندگی کے حسین ترکش میں
کتنے بے رحم تیر ہوتے ہیں

اس حد تک تو عطا اپنے سامعین کی پسند ناپسند کا خیال رکھتا تھا' مگر ہر رات وہ گیت

اور ڈوھڑے وغیرہ اپنی پسند کے مطابق گاتا تھا اور اپنی مرضی کی ترتیب اور انتخاب میں کسی دوست کو مخل نہیں ہونے دیتا تھا۔ پھر جس حسن ترتیب اور حسن ادا سے وہ گاتا تھا اس میں مخل ہونے کی گنجائش ہی کہاں ہوتی تھی ۔۔۔ بارہا سنائے ہوئے گیت کو بھی وہ ہر بار کوئی نہ کوئی ایسا نیا ٹچ دے دیتا کہ سامعین اسی کی تحسین کا حق ادا نہ کرپاتے۔ بالخصوص ڈوھڑے اور ماھیئے کا انداز تو ہر دوسرے تیسرے دن یکسر مختلف ہوتا۔ ان دو اصناف میں عطا نے ایسے ایسے انوکھے انداز وضع کئے کہ اس کی صلاحیت اختراع کی داد الفاظ میں نہیں دی جاسکتی۔ اس سلسلے میں میرا یہ دعویٰ بے جا نہ ہوگا کہ ڈوھڑہ اور ماھیا کے جتنے مختلف انداز عطا نے ایجاد کئے ہیں تمام ہم عصر گلوکار مل کر بھی اتنا تنوع تخلیق نہیں کرسکتے۔

رُٹھی نہ منیساں ۔۔۔۔

وہ رات جب عطا ایک تازہ جذباتی سانحے سے دوچار ہوا تھا۔ اس رات کے سامعین۔ ماسٹر وزیر' لالا یوسف خان' ملازم حسین طبلہ نواز اور میں ۔۔۔۔ لالا نے اس رات صرف ایک ہی گیت گایا ۔۔۔ جی ہاں' مسلسل چار گھنٹے ایک ہی گیت ۔۔۔ ایک قدیم لوک گیت پر میری تضمین ۔۔۔ بول تھے "رُٹھی نہ منیساں بھوں ناراض آں ڈھولے تے"

آغاز گیت کا اس ڈوھڑے سے ہوا

سجن میڈے کوں سمجھ نہ آئی' سمجھیندیاں عمراں ڈھل گئی
پچھے دلبر دے میں کملے دی سکھی جندڑی دکھاں وچہ گل گئی

اس ڈوھڑے کے بعد گیت کا پہلا بند اور پھر ۔۔۔ اسی بند کے مفہوم پر فیض فراز' شکیب' سیف اور ساحر کے اشعار' یونس خاں مرحوم کے دوھڑے اور جگر گداز ماہیے۔ یہ سب کچھ اس حسن ترتیب سے کہ اول سے آخر تک ایک ہی شاعر کا کلام لگتا تھا۔ شکوہ و شکایت سے لبریز اس تمام تر شاعری کے پس منظر میں ایک تازہ بخش ۔۔۔ محبوب زود رنج کی بے جا برہمی کا دکھ ۔۔۔

ہوا یہ تھا کہ عطا کے بعض بزرگوں کی فرمائش پر بس سٹینڈ کی جامع مسجد کے خطیب صاحب نے جمعہ کے خطبے میں پورا زور خطابت عطا کے ایک تازہ معاشقے کی مذمت میں صرف کر دیا۔ ان کے محبوب دلنواز کے وہ وہ لچھن بیان فرمائے کہ سامعین کانوں کو ہاتھ لگاتے نہیں تھکتے تھے۔ ستم یہ کہ گھر اس بت کافر کا عین مسجد کے زیر سایہ واقع تھا۔ لہٰذا لاؤڈ اسپیکر کی وساطت سے اس نے بھی یہ سب کچھ اپنے حسین و جمیل کانوں سے سنا۔

ادق عربی گالیاں تو اس کی سمجھ میں کیا آئی ہوں گی ' البتہ حضرت واعظ کے لب و لہجے سے اتنا اندازہ ضرور لگالیا کہ بات اس کے حسن و جمال کی نہیں ' بلکہ کردار کی ہو رہی ہے۔

نتیجہ یہ ہوا کہ شام کو وقت معین پر عطابن سنور کر کوئے دلدار سے گزرا تو اس گھر کی منڈیر سونی پڑی تھی --- صرف ایک نامراد کوا اپنی کرخت بولی میں اس ویرانی کے اسباب پر روشنی ڈالنے کی ناکام کوشش کرتا نظر آیا۔

گھر واپس آکر قاصد کی خدمات حاصل کیں تو جواب یہ آیا کہ بس صاحب ' بہت ہو چکی۔ اب مرتے دم تک آپ سے نہ بات ہوگی نہ ملاقات --- نامہ و پیام سب موقوف۔

عطا نے بڑے صبرو تحمل سے یہ جواب سنا۔ چند لمحے سر جھکائے کچھ سوچتا رہا --- پھر چپ چاپ اٹھا اور برابر والے کمرے سے ہارمونیم اٹھالایا۔ چند منٹ اس کی خوبصورت انگلیاں ہارمونیم کے سروں سے کھیلتی رہیں اور پھر کسی زخمی پرندے کی طرح پھڑپھڑاتا یہ مصرعہ اونچے سروں کی شاخوں سے ٹپک کر کائنات کی جھیل کی پر سکون سطح میں ارتعاش پیدا کر گیا۔

رٹھی نہ منہساں بہوں ناراض آں ڈھولے تے

اس مصرعے کے ہمراہ عطا کے دو آنسو بھی تھے جو ہارمونیم کے سروں میں گر کر پہلے تو نظروں سے اوجھل ہو گئے ' مگر آواز کی شکل میں ہارمونیم سے نکلے تو درو دیوار پر بھی رقت طاری ہو گئی --- اس کے بعد ناطق کا ڈوھڑہ --- پھر اس گیت کا مکھڑا۔ اور پھر فیض ' فراز اور شکیب وغیرہ کے اشعار ' مزید ڈوھڑے سے اور ماھیئے اور ہر شعر ' ڈوھڑے اور ماھیئے کے بعد

رٹھی نہ منہساں بہوں ناراض آں ڈھولے تے

گلو کار کی آنکھوں میں آنسو ' سامعین دنیا و مافیہا سے بے خبر --- پوری کائنات ایک سوز میں ' ڈوبی آواز بن کر بار بار یہی ایک مصرعہ الاپ رہی تھی

رٹھی نہ منہساں بہوں ناراض آں ڈھولے تے

اور پھر --- پتہ ہے کیا ہوا ؟ --- دروازے پر ایک ہلکی سی دستک سنائی دی۔

یاد میں تیری جاگ جاگ کے ہم -----

محمد رفیع مرحوم کا یہ مشہور و معروف گیت عطا سے بارہا سنا --- مگر وہ رات --- عطا کے ایک دوست عاصم ' عطا اور میں --- سردیوں کی تاریک رات مسلسل شدید بارش

کے باعث میکدے کے بقید ہم نشیں اپنے اپنے گھروں میں مقید رہے ۔۔۔ ہم نے شام کا کھانا میکدے ہی میں کھایا ۔ کچھ دیر ادھر ادھر کی باتیں کرتے رہے ۔ اور پھر حسب معمول عطا ہارمونیم اٹھالایا ۔ وہیں چارپائی پر ہارمونیم رکھ کر اس نے محمد رفیع مرحوم کا یہ گیت چھیڑا ۔ گیت شروع ہوتے ہی عاصم کی آنکھوں سے آنسو بہہ نکلے ۔ بس پھر کیا تھا ' ذرا سی دیر میں ہم تینوں (خدا جانے کیوں) زارو قطار رو رہے تھے ۔ صبح تک نہ بارش رکی ' نہ ہمارے آنسوؤں کی جھڑی اور نہ گیت ۔ ایک ایک مصرعہ بیسیوں بار دہرایا گیا ۔ اور درمیان میں عطا نے حسب عادت برمحل ڈوھڑوں ' ماہیوں اور اشعار سے وہ رنگ باندھا کہ پوری کائنات کے دکھ درد سمیٹ کر اس چھوٹے سے سادہ سے کمرے کے درودیوار پر سجا دیئے ۔ جدھر نگاہ اٹھتی آنسوؤں کا ایک سیل رواں آنکھوں میں اڈ آتا ۔

حیرت کی بات یہ ہے کہ اگلی صبح ہم نے ایک دوسرے سے اس قدر زارو قطار رونے کا سبب پوچھا ' تو ایک اداس تبسم کے ساتھ ہر ایک نے یہی ایک جواب دیا ۔۔۔

"بس یونہی"

تنگ دستی کے وہ دن ۔۔۔۔۔

اس زمانے میں عیسیٰ خیل میں ٹیپ ریکارڈر اکا دکا خوش نصیبوں کے پاس ہوا کرتا تھا ۔ اپنا ٹیپ ریکارڈر خریدنے کی توفیق ہم لوگوں میں سے کسی کو بھی نصیب نہ تھی ۔ مگر ہر رات کی محفل ریکارڈ کرنے کا شوق دست سوال دراز کرنے پر مجبور کردیتا تھا ۔۔۔ دست سوال دراز کرنے میں کئی تلخ تجربے بھی ہوئے ۔ ضمیر بھی برابر ملامت کرتا رہا ۔ مگر مفلسی ضمیر کی آواز پر کان دھرنے لگے تو زندگی جہنم نہ بن جائے ؟

کبھی عطا کہتا " لالا منور آج فلاں صاحب سے ٹیپ ریکارڈر تمہیں منگوانا ہوگا ۔ پچھلے ہفتے میں نے منگوایا تھا ۔ اب دوسری بار مانگتے شرم آتی ہے ۔ کبھی میں عطا سے کہتا ۔ "لالا ' میرے فلاں شاگرد نے نیا ٹیپ ریکارڈر خریدا ہے ۔ کہو تو آج وہی منگوا لیں ۔ "

میرے دو شاگردوں (حفیظ خان اور مجیب اللہ ہاشمی) کے ٹیپ ریکارڈر ان دنوں زیادہ تر میری ہی تحویل میں رہے ۔

تنگ دستی کے اس عالم میں جب ہمارے ایک ہم نشیں (ملک یار محمد پی ٹی آئی) کو اپنا ٹیپ ریکارڈر نصیب ہوا تو ہم نے اطمینان کا سانس لیا ۔ جے وی سی (jvc) کا یہ ٹیپ ریکارڈر ان کے کسی عزیز نے سعودی عرب سے بھجوایا تھا ۔ ایک عرصہ تک ہر رات کی محفل اسی

ٹیپ ریکارڈر سے ریکارڈ ہوتی رہی۔ اس زمانے میں سرائیکی اور پنجابی کے شعراء کی وہ بھرمار نہ تھی جو آج ہے۔ اس لئے عطا زیادہ تر پرانے مقامی شعراء کا کلام گاتا تھا۔ پیر فرید فقیر کے علاوہ دو مرحوم مقامی شعراء، میانوالی کے ابراہیم غریب اور عیسیٰ خیل کے یونس خان کا کلام ایک مدت تک میکدے کی محفلوں میں خراج تحسین پاتا رہا۔ بالخصوص یونس خان کے یہ گیت تو ہر رات بلا ناغہ گائے جاتے

کلا شاہ بدلا ناں وس توں ساڈے دیس
کیوں جے اجے تیئیں ماہی راہندا اے پردیس
شالا رج رج مانڑیں سجن میڈا
ایہو جوبن اٹھ دی جوانی دا

اور

کر کر منتاں یار دیاں
آخر آن جوانی ڈھلی

اور

جھیڑے ڈیند دا توں ہننڑاں نکھڑ گیا ایں
غم ڈاہڈا ہاں کوں لائی پئی آں

مجبور عیسیٰ خیلوی کے یہ دو گیت بھی اکثر سنے جاتے

ڈے جاسی شالا جھگڑا وسی میڈی رانی

اور

بودی چھنگا ژنگ ژنگ

مئوخر الذکر گیت (بودی چھنگا ژنگ ژنگ) کی دھن بے حد مترنم اور وجد آور دھن ہے۔ اس لئے اس گیت کے ساتھ اجتماعی یا انفرادی رقص بھی ضرور ہوتا۔ شادی بیاہ کی تقریبات میں اس گیت پر اچھے خاصے سفید پوش بزرگوں کو ناچتے دیکھا ہے۔ والہانہ رقص کے ان بے ساختہ مظاہروں میں کئی چھپے رستم منظر عام پر آئے۔ خاص طور پر بعض عمر رسیدہ بزرگوں کی رقص میں مہارت دیکھ کر یہ اندازہ ہوتا تھا کہ ماضی قریب تک لوگوں کا اپنے کلچر سے کتنا قریبی تعلق تھا۔ مگر آج ہم ترقی پسندی کے شوق میں اسے کتنا پیچھے چھوڑ آئے ہیں۔

ذکر گیتوں کا ہو رہا تھا، بات رقص تک جا پہنچی۔ بہرحال اتنی دور نہیں گئی۔ گیت سے رقص تک ایک ہی قدم کا تو فاصلہ ہے۔

اسی زمانے میں ریڈیو پاکستان ملتان سے کوثر ملک کی آواز میں معروف لوک گیت "
گکڑا دھمی دیا سویرو ڈتی ایئی بانگ "
نشر ہوا تو عطا کو پسند آگیا اور اسی شام سے یہ گیت بھی میکدے کی محفلوں کا مستقل
آئیٹم بن گیا۔
ان گیتوں کے علاوہ عطا بعض اوقات اپنی پسند کے مشہور فلمی گیت بھی گایا کرتا تھا۔
مثلاً محمد رفیع مرحوم کے یہ گیت

☆ کوئی مجھ سے پوچھے کہ تم میرے کیا ہو

اور ۔۔۔ یاد میں تیری جاگ جاگ کے ہم
رات بھر کروٹیں بدلتے ہیں

لتا منگیشکر کا یہ مشہور زمانہ گیت

وہ دل کہاں سے لاؤں ' تیری یاد جو بھلا دے
مجھے یاد آنے والے کوئی راستہ دکھا دے

پھر ملکہ ترنم کا یہ پنجابی گیت

محبت تیری ' زندگی میری

غزلوں میں عدم مرحوم کی یہ غزل

جو بھی تیرے فقیر ہوتے ہیں
آدمی بے نظیر ہوتے ہیں

استاد قمر جلالوی مرحوم کی بعض معروف غزلیں ۔۔۔ اور (کلام خدا جانے کس کا ہے)
یہ دو خوبصورت غزلیں

انہیں قصہ غم جو لکھنے کو بیٹھے ' تو دیکھے قلم کی روانی میں آنسو
یقیناً اثر ان کا ہوتا ہے دل پر نکلتے ہیں جو بے زبانی میں آنسو

اور

بے وفا یوں ترا مسکرانا بھول جانے کے قابل نہیں ہے

ان تمام گیتوں اور غزلوں کے ہمراہ یونس خان ' ابراہیم غریب اور ناطق نیازی کے ڈوھڑے اور اور درد بھرے ماہیے مل کر سروں کی ایک قوس قزح سی فضا میں بکھیر دیتے۔ اردو کی غزلوں اور گیتوں میں پنجابی اور سرائیکی شاعری کی خوبصورت آمیزش عطا کا وہ کمال ہے جس نے اسے معاشرے کے ہر طبقے کا محبوب گلو کار بنا دیا۔ اس کمال نے میکدے ہی میں جنم لیا اور وہیں جوان ہو کر کیسٹوں کی وساطت سے منظر عام پر آیا۔

ریاض کے اس دور میں بارہا ایسا بھی ہوا کہ ریڈیو یا ٹیلی ویژن پر نشر ہونے ولا کوئی گیت عطا کو پسند آگیا تو اس نے وہ گیت ریکارڈ کرلیا۔ اور تنہائی کے لمحات میں اس گیت کو بار بار سن کر اس کے الفاظ یاد کرلئے۔ پھر اس کی دھن کو اپنے مخصوص رنگ سے آراستہ کر کے محفل شب میں پیش کر دیا۔ مثلاً استاد امانت علی خان مرحوم کی آواز میں ابن انشاء کی شہرۂ آفاق غزل۔

انشاجی اٹھو اب کوچ کرو اس شہر میں جی کا لگانا کیا
وحشی کو سکوں سے کیا مطلب جوگی کا نگر میں ٹھکانا کیا

پسند آگئی تو کسی دوست کی معرفت استاد امانت علی خان کا وہ لانگ پلے ریکارڈ منگوالیا جس میں یہ غزل پہلی بار ریکارڈ کی گئی تھی۔ اس غزل کی خاطر اپنا گراموفون بھی خریدا اور چند دن شب و روز یہ غزل سننے کے بعد اسے نہایت خوبصورت انداز میں گانے لگا۔

یادوں کا تحفظ

جیسا کہ پہلے کہیں عرض کر چکا ہوں عطا میکدے کی ہر شب کی محفل کی کارروائی (صرف موسیقی والا حصہ) ایک کیسٹ کی شکل میں محفوظ کر لیتا تھا۔ میرے اندازے کے مطابق وہ تمام کیسٹ اب بھی عطا کے پاس محفوظ ہیں۔ ان کیسٹوں میں گیتوں کے علاوہ احباب کی داد بھی محفوظ ہے۔ ہر آدمی کا اپنا انداز تھا۔ بعض کیسٹوں کی نقل احباب کے ہاتھوں پھرتی پھراتی بعض مقامی میوزک سنٹروں کے ہاتھ لگ جاتی تو اس کی سینکڑوں کاپیاں دھڑا دھڑ بازار میں بکنے لگتیں۔ آج کل بھی ۷۷۔۱۹۷۶ء میں ریکارڈ کئے ہوئے بعض کیسٹوں کی نقلیں بازار میں بک رہی ہیں۔ اور ہم اکثر شہر میں پھرتے پھراتے کسی ہوٹل کے سامنے سے گزرتے ہیں تو وہاں با آواز بلند بجتے ہوئے عطا کے کیسٹ میں سے اپنی آواز میں جیو لالا کی صدا سن کر چونک اٹھتے ہیں۔ اور پھر زیر لب مسکرا کر آگے بڑھ جاتے ہیں۔ بعض اوقات نور محمد دیوانہ کی آواز میں "جیویں" سن کر آنکھوں میں آنسو اُمڈ آتے ہیں۔ یوں میکدے کی یادیں قدم قدم پر دامن دل تھام کر ہمیں ماضی سے بچھڑنے نہیں دیتیں۔

چاندنی راتیں-----

عیسیٰ خیل دریائے سندھ کے دائیں کنارے پر دریا سے تقریباً ڈیڑھ میل کے

فاصلے پر واقع ہے، مگر دریا کی ایک شاخ جسے مقامی زبان میں واہی کہتے ہیں شہر کے جنوبی کنارے سے لگ کر گزرتی ہے۔ واہی کی چوڑائی تقریباً ۱۰۰ میٹر اور گہرائی پانچ سات فٹ سے زیادہ نہیں ہوتی۔

موسم گرما کی چاندنی راتوں میں بعض اوقات موسیقی کی محفل واہی کی شفاف پر سکون سطح پر ایک کشتی میں برپا ہوتی۔ عطا کی پر سوز آواز فضا میں بلند ہوتی تو سندھ کے پانی کی سطح پر چاند کا والہانہ رقص ایک عجیب سا سماں باندھ دیتا۔ حیرت سے دم بخود ستارے آنکھیں جھپکنا بھول جاتے۔ اور سطح آب سے چھو کر گذرتی ہوئی ہوا کے قدم بے اختیار رک جاتے ـــ۔ چاندنی راتوں کی ان روح پرور محفلوں کا سرور ان محفلوں کے حاضرین کو آج بھی رگ رگ میں محسوس ہوتا ہے۔

چاند کی پاکیزہ کرنوں، سندھ کے معطر پانی اور سطح آب پر تھرکتی ہوا سے براہ راست اکتساب فیض ہر فن کار کے نصیب میں کہاں؟ عطا کو دوسرے فن کاروں سے ممتاز کرنے میں اور باتوں کے علاوہ، فطرت سے اس براہ راست تعلق کا بھی بہت کچھ عمل دخل ہے۔ چاند کی کرنوں اور دریا کی روانی کی طرح عطا کی آواز بھی دنیا کے کسی خطے کے لئے اجنبی نہیں۔ اور اپنے تعارف کے لئے یہ بھی کسی زبان کی محتاج نہیں۔ یہ آواز وہ آواز ہے جس نے گلو کاری کا فن کسی معروف گھرانے سے نہیں بلکہ خود فطرت سے سیکھا ہے۔ یوں لگتا ہے جیسے ورڈزورتھ نے یہ خوبصورت الفاظ عطا ہی کے لئے تحریر کئے تھے کہ قدرت نے کہا

My self shall to my darling be
Both law and impulse and with me
The child in rock and plain
In glade and bower in sun and shower
Shall feel an everseeing power
To kindle or restrain

جب ہم پہلی بار ملے تھے

عیسیٰ خیل سے ہمارا تعارف پہلے ہوا، عیسیٰ خیلوی سے بہت بعد میں ـــ۔ عیسیٰ خیل سے تعارف تو ۱۹۵۳ء میں ہوا جب ہم ساتویں جماعت کے طالب علم تھے اور ہمارے

والد محترم گورنمنٹ ہائی سکول عیسیٰ خیل میں ہیڈ ماسٹر تھے۔۔۔ عیسیٰ خیلوی اس وقت بمشکل ڈیڑھ دو برس کا ہو گا للذا اس کے فن اور شخصیت کے بارے میں کچھ معلوم نہ ہو سکا۔ کچھ معلوم نہ ہونے کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ اس زمانے میں ہمارے اردو اتنی کمزور تھی کہ فن اور شخصیت کے معنی بھی معلوم نہ تھے۔

عیسیٰ خیلوی سے تعارف کا آغاز ۱۹۷۴ء میں ہوا۔ داؤد خیل میں ہمارے ایک دوست فضل داد خان ایک دن عطا کا ایک پرانا گھسا پٹا کیسٹ کہیں سے لے آئے۔۔۔ کیسٹ گھسا پٹا تھا، مگر آواز ہمارے لئے بالکل نئی تھی۔ صرف نئی ہی نہیں، بے حد موثر بھی۔۔۔ پہلی نظر میں مبتلائے عشق ہونے سے تو ہم اللہ کے فضل سے آج تک محفوظ ہیں، مگر پہلی آواز پر مبتلائے عشق ہونے سے نہ بچ سکے، اس لئے کہ آواز عطا کی تھی۔۔۔ اس آواز کو سن کر یوں لگا جیسے میرا ماضی مجھ سے بچھڑنے پر ماتم کناں ہو۔۔۔ یوں لگا جیسے بچپن میں جب کبھی میں بیمار ہوتا تو راتوں کے پچھلے پہر میری ماں میری تپتی ہوئی پیشانی پر ہاتھ رکھ کر ایک دعائیہ لوری گنگنایا کرتی تھی۔۔۔ عطا جو گیت گا رہا تھا اس کی دھن اسی لوری سے ملتی جلتی تھی۔۔۔ وہی محبت بھری آواز میرے لاشعور میں سے آتی ہوئی سنائی دی۔۔۔ اور

دل کو کئی کہانیاں یاد سی آ کے رہ گئیں

ہر کہانی کا مرکزی خیال میری کوئی نہ کوئی محرومی تھی اور مرکزی کردار میں خود۔۔۔ احساس محرومی کا ایک اپنا سرور ہوتا ہے۔۔۔ اس سرور کے عالم میں انسان کو خدا اپنی شہ رگ سے بھی زیادہ قریب محسوس ہوتا ہے۔۔۔ اسی سرور کے عالم میں جب مجبور اور بے بس انسان پکار اٹھتا ہے۔

خدائی رکھ کول آہنڑویں

تو اسے نہ صرف یار دا ویڑہ، بلکہ خدا خود بھی مل جاتا ہے۔۔۔ یہ وہ مقام ہے جہاں شکوہ بھی شکر شمار ہوتا ہے۔

بات بہت دور نکل گئی۔ ذکر عطا سے تعارف کا ہو رہا تھا۔۔۔ عرض کیا نا کہ تعارف کا آغاز تو اس پہلے کیسٹ سے ہوا۔ اس سے اگلا قدم ملاقات کا تھا۔

موسم گرما کی ایک غضبناک دوپہر کو چار افراد کا ایک قافلہ دو موٹر سائیکلوں پر داؤد خیل سے عیسیٰ خیل روانہ ہوا۔ فضل داد خان اور میں، ایک موٹر سائیکل پر، ضیاء اللہ خان (مرحوم) اور عبدالخالق دوسرے موٹر سائیکل پر۔ راستے میں، عیسیٰ خیل سے پانچ میل ادھر کلور کے قریب ایک حادثہ بھی سرزد ہوا جس کے نتیجے میں ضیاء اللہ خان اور عبدالخالق کے گھٹنے اور

کہنیاں بری طرح زخمی ہوگئیں مگر یہ اللہ کے بندے پھر بھی خوش تھے کہ جان تو بچ گئی۔ دو لہو لہان ساتھیوں کے ہمراہ ہم عیسیٰ خیل شہر میں داخل ہوئے تو لوگ قدم قدم پر روک کر پوچھتے کہ خیریت تو ہے؟ کسی سے لڑائی جھگڑا تو نہیں ہوا۔۔۔؟ اور ہم الٹے سیدھے جواب دیتے آگے بڑھ جاتے۔

عطا کے گھر کا اتا پتہ پوچھنے کے لئے میرے ایک پرانے دوست احسن خان صاحب کے ہاں پہنچے ان سے یہ سن کر بہت خوش ہوئے کہ عطا ان کے قریبی عزیز ہیں' لہٰذا عطا سے تعارف میں بھی دقت پیش نہیں آئے گی۔ چائے وغیرہ سے ہماری تواضع کرنے کے بعد احسن خان صاحب ہمیں ہمراہ لے کر عطا کے ہاں پہنچے۔

خوش قسمتی سے ہم عین وقت پر پہنچے کیونکہ عطا اس وقت کہیں جانے کے ارادے سے میکدے کو تالا لگا رہا تھا۔ ہمیں دیکھ کر رک گیا۔ پہلی بار عطا کو دیکھ کر ہمیں کچھ حیرت سی ہوئی۔ کیسٹ میں نغمہ سرا آواز سے ہم نے اس کی عمر کے بارے میں جو اندازہ لگایا تھا' سراسر غلط نکلا۔ ہمارا اندازہ تھا کہ اس کی عمر تیس پینتیس برس سے کم نہ ہوگی' مگر ہمارے سامنے بیس بائیس سال کا دبلا پتلا سانولے رنگ کا نوجوان گہرے زرد رنگ کی شلوار قمیض میں ملبوس' آنکھوں پر سیاہ چشمہ لگائے کھڑا مسکرا رہا تھا۔

میکدے کا دروازہ کھول کر عطا نے ہمیں بٹھایا' اور ملازم حسین طبلہ نواز کی تلاش میں کسی کو بھیج کر خود چائے پانی کا بندوبست کرنے گھر چلا گیا۔ واپس آیا تو کچھ دیر ادھر ادھر کی باتیں ہوتی رہیں۔ وہی باتیں جو آغاز تعارف میں عموماً ہوتی ہیں۔ موسم کا حال' سفر کی داستان' گھر بار کی خیریت' ہمارے دو زخمی ساتھیوں کے زخمی ہونے کا قصہ البتہ ایک نئی بات تھی۔ حادثے کی تفصیلات بتائی گئیں۔ متاثرین کے زخموں کی نمائش ہوئی ۔۔۔ میں نے عطا سے کہا کہ صاحب' دل کے زخموں کے مسیحائی تو آپ کی آواز بلاشبہ کر دیتی ہے' آج ذرا ہمارے ان دو ساتھیوں کے گوڈوں گٹیوں کی چارہ گری بھی ہو جائے۔ اس بات پر زخمیوں سمیت سب نے ایک بھرپور قہقہہ لگایا ۔۔۔ اتنے میں ملازم حسین طبلوں کی جوڑی کندھے سے لٹکائے آگیا۔ علیک سلیک ہوئی ۔۔۔ عطا ساتھ والے کمرے سے ہارمونیم اٹھا لایا ملازم حسین نے طبلے کے مزاج درست کئے اور محفل موسیقی کا آغاز ہوا ۔۔۔ سب سے پہلے عطا نے ایک غزل سنائی۔ مطلع تھا

انہیں قصہ غم جو لکھنے کو بیٹھے تو دیکھے قلم کی روانی میں آنسو
یقیناً اثر ان کا ہوتا ہے دل پر نکلتے ہیں جو بے زبانی میں آنسو

اس کے بعد یونس خان کا مشہور گیت

شالا رج رج مانیں سجن میڈا اہو جوبن اٹھدی جوانی دا
سدا قائم رہی رنگ مدھ بھریا تیڈی چن جئی شکل نورانی دا

محفل تقریباً دو گھنٹے جاری رہی۔ عطا کو سن کر یہ محسوس ہوا کہ کیسٹ سننا تو خط کی طرح آدھی ملاقات ہے۔ اصل مزا تو سامنے بیٹھ کر سننے میں ہے کہ عطا سامعین کے مزاج کے عین مطابق اور ان کی توقعات سے کہیں زیادہ خوبصورت انداز میں گاتا ہے۔۔۔ سامعین کے دل کی بات بن پوچھے سمجھ کر وہی بات اشعار اور ماہیوں کی صورت میں پیش کرنے کا کمال عطا ہی کا حصہ ہے۔ محفل کتنی ہی بڑی کیوں نہ ہو' عطا پوری محفل کو ساتھ لے کر چلتا ہے اور کوئی بھی فرد خود کو تنہا محسوس نہیں کرتا۔

نمبردار کے سر پہ ہارمونیم

اگلے ہفتے فضل داد خان اور میں عطا کو لینے کے لئے عیسیٰ خیل پہنچے۔ عطا نے بتایا کہ وہ بعض گھریلو مصروفیات کے باعث شام کے بعد ہی داؤد خیل پہنچ سکے گا۔ شام کے وقت عیسیٰ خیل سے داؤد خیل کو چونکہ کوئی بس وغیرہ نہیں جاتی تھی اس لئے طے یہ ہوا کہ ہم موٹر سائیکل عطا کے پاس چھوڑ جائیں اور خود ملازم حسین کو ہمراہ لے کر بس سے چلے جائیں۔ ملازم حسین کے ہمراہ ہارمونیم اور طبلوں کی جوڑی بھی تھی۔ جوڑی تو اس نے خود اٹھائی' ہارمونیم فضل داد خان کے حصے میں آیا۔۔۔ (فضل داد خان چونکہ سکول کے زمانے میں ہمارے شاگرد رہ چکے تھے' لہٰذا ہارمونیم اٹھانے کی سعادت طوعاً و کرہاً انہیں کو برداشت کرنا تھی)۔ دلچسپ بات یہ تھی کہ فضل داد خان اس زمانے میں اپنے محلے کے نمبردار بھی تھے۔۔۔ نمبردار کے سر پہ ہارمونیم۔۔۔ ہے نا انوکھی بات؟

فضل داد خان کو یہ فکر لاحق تھی کہ اس حالت میں اگر کوئی واقف کار مل گیا تو کیا ہو گا؟ اس لئے ہم نے بس سٹاپ پر جانے کی بجائے کی بجائے عادل بخاری کے قبرستان میں سے ہو کر شہر سے باہر ریسٹ ہاؤس کے قریب بس روکنے کا فیصلہ کیا۔۔۔ بس تو جلد مل گئی مگر ایک لطیفہ وہاں بھی ہو گیا۔۔۔ بس رکی تو کنڈیکٹر نے ہارمونیم کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فضل داد خان سے کہا "استاد' یہ اندر رکھو گے یا بس کی چھت پہ رکھ دوں؟ ہارمونیم کے حوالے سے اپنے لئے استاد کا لقب سن کر فضل داد خان جھنجلاہٹ کے باوجود ہنسی ضبط نہ کر سکے۔ جب کبھی ان سے ملاقات ہوتی ہے کنڈیکٹر کا یہ فقرہ بار بار دہرا کر ہم دونوں بے تحاشا ہنستے ہیں۔

داؤد خیل کے بس سٹینڈ پر بس رکی تو اتفاق سے فضل داد خان کے ماموں جان سامنے کھڑے تھے ۔۔۔ ان کے سامنے ہارمونیم کو ہاتھ لگانا فضل داد خان کے لئے خاصا نقصان دہ ثابت ہو سکتا تھا۔۔۔ ہارمونیم اٹھا کر بس سے بر آمد ہونا ہماری غیرت کو بھی گوارا نہ تھا۔ ادھر کنڈیکٹر شور مچا رہا تھا کہ " استادو اب نیچے بھی اترو۔ بس کو آگے بھی جانا ہے ۔ "
سخت کشمکش کے اس عالم میں میری نظر اپنے سکول کے چپراسی خادم حسین پر پڑی۔ اطمینان کا ایک طویل سانس لے کر ہم نے اسے قریب آنے کا اشارہ کیا۔ ہارمونیم اس کے سر پہ رکھا اور بس سے اتر کر گھر کی راہ لی۔
شام کے بعد عطا بھی حسب وعدہ پہنچ گیا۔ اعجاز خان اس کے ہمراہ تھے ۔ رات بھر موسیقی کی محفل برپا رہی ۔ یہ محفل اس لحاظ سے ایک یادگار محفل تھی کہ اس سے داؤد خیل کے لوگوں پر ہماری اہمیت روز روشن کی طرح واضح ہو گئی ۔ اور عطا کا دوست سمجھ کر کچھ ایسے لوگ بھی ہمارے عقیدت مندوں میں شامل ہو گئے جن سے ہم ہمیشہ ذرا بچ کے گذرتے رہے۔
صبح چار بجے کے قریب محفل ختم ہوئی اور عطا نے ہم سے اجازت چاہی ۔ بادل ناخواستہ ہمیں اجازت دینا ہی پڑی ' کیونکہ اعجاز خان نے علی الصبح پنڈی روانہ ہونا تھا۔

داؤد خیل میں

۱۹۷۴ء میں داؤد خیل کے بعض احباب کے پرزور اصرار پر ہم نے عطا کو داؤد خیل میں ایک محفل نغمہ منعقد کرنے کی دعوت دی ۔ یہ محفل فضل داد خان کے ایک عزیز کے گھر پر منعقد ہوئی ۔ نہایت غریب و سادہ سی محفل تھی ۔ نہ سٹیج کا اہتمام ' نہ لاؤڈ اسپیکر کا انتظام ' تمام تر رازداری کے باوجود اس تقریب کی خبر گلی محلے کی حد تک پھیل ہی گئی اور دیکھتے ہی دیکھتے ۔ تین چار سو افراد کا مجمع اکٹھا ہو گیا۔
محفل تقریباً ۴ گھنٹے برپا رہی ۔ عطا نے بہت ٹوٹ کر گایا ۔ اس محفل کے سامعین آج تک اس مترنم رات کے سحر سے آزاد نہیں ہو سکے ۔ دیہات میں بجلی کی آنکھ مچولی تو روزمرہ کا معمول ہے ۔
محفل عین شباب پر تھی کہ بجلی غائب ہو گئی ۔ گھپ اندھیرا چھا گیا۔ مگر سامعین کی محویت کا یہ عالم تھا کہ بجلی کے غائب ہونے کا کسی کو احساس تک نہ ہوا۔ مگر اس سے بھی زیادہ حیرت کی بات یہ تھی کہ خود گلوکار بھی محویت کے اسی عالم میں گم تھا۔ یک لخت تاریکی

چھا جانے پر بھی نہ تو اس نے گانا بند کیا' نہ اس کی آواز پر اس اچانک تبدیلی کا کوئی اثر ہوا' اور نہ ہارمونیم کے سروں پر اس کی انگلیوں کے رقص میں لغزش آئی۔ اس قدر اعتماد سے نغمہ سرائی کرتا رہا جیسے کچھ ہوا ہی نہ تھا۔۔۔

تقریباً بیس منٹ کی تاریکی کے اس وقفے کا علم سب لوگوں کو اس وقت ہوا' جب بجلی اچانک واپس آ گئی۔

میل مقدراں دے

یہ قصہ اس زمانے کا ہے جب ہم گورنمنٹ مڈل سکول ٹھٹھی (ضلع میانوالی) میں ہیڈ ماسٹر کے منصب جلیلہ پر فائز تھے۔ عطا سے تعلق خاطر پیدا ہوا تو دل میں یہ خواہش انگڑائیاں لینے لگی کہ کسی بہانے ہم مستقل طور پر عیسیٰ خیل جا بسیں۔ کاش ہماری ہر خواہش اس خواہش کی طرح بہت جلد پوری ہو جاتی۔

چند ماہ بعد پبلک سروس کمیشن کی مہربانی سے ہم انگریزی کے لیکچرار بن گئے تو ہماری خوش نصیبی دیکھیے کہ تقرر گورنمنٹ کالج عیسیٰ خیل میں ہوا۔ اس حسن اتفاق پر عطا بھی بہت خوش ہوا۔ اور یوں ہم دونوں ایک عرصہ تک ہم نوالہ دوست بن گئے (ہم پیالہ بننے کا اعزاز آج تک نصیب نہیں ہوا۔ اور ہم اپنی اس محرومی پر خوش ہیں۔

یہ وہ زمانہ تھا جب میکدہ پوری طرح آباد تھا۔ ہر رات آٹھ بجے سے دو بجے تک عطا اپنی آواز کا جادو جگاتا۔ اپنی حیرت انگیز تخلیقی صلاحیتوں کو بروئے کار لا کر نت نئی دھنیں ایجاد کرتا۔ پرانی دھنوں میں نت نئی تبدیلیاں کر کے ان کو نیا رنگ دیتا۔ آواز کی فضا میں بلند پروازی کے نت نئے ریکارڈ قائم کرتا۔ ہارمونیم کی زبان سمجھنے والے لوگ جانتے ہیں کہ ہارمونیم کے چوتھے اور پانچویں کالے سر سے کسی گیت کا آغاز کر کے گانا کتنا مشکل ہے۔ اتنی بلند آواز میں گیت شروع کیا جائے تو دو تین سر آگے جا کر آواز اور سروں کی رفاقت زیادہ دیر تک برقرار نہیں رہ سکتی۔ مگر یہ عطا ہی کا کمال تھا کہ سات کی بجائے نو اور دس سروں تک کے طویل سفر میں بھی اس کی آواز کے ترنم میں سرمو فرق نہ آتا۔

اس زمانے میں عطا کا تعارف اکا دکا کیسٹوں کی وساطت سے اپنے ہی ضلع تک محدود تھا۔ یہ تعارف بھی صرف آواز کی حد تک تھا۔ صورت آشنا لوگ بہت کم تھے۔ اس ضمن مین ایک دو واقعات کا ذکر دلچسپی سے خالی نہ ہو گا۔

کوئی آشنا نہ تھا

ایک مرتبہ عطا اور میں بس کے ذریعے عیسیٰ خیل سے داؤد خیل آئے۔ داؤد خیل کے بس سٹینڈ پر دو نوجوان نہر کے کنارے بیٹھے عطا کا ایک کیسٹ سن رہے تھے۔ تجاہل عارفانہ سے کام لیتے ہوئے میں نے ان سے پوچھا یہ کیسٹ کس کا ہے۔

"عیسیٰ خیل کا ایک خان ہے عطاء اللہ"۔ اس کا ہے ایک نوجوان نے کہا

"عطاء اللہ کو کبھی دیکھا بھی ہے"۔ میں نے پوچھا۔

"ایک مرتبہ ایک شادی میں دیکھا تھا" اس نے جواب دیا

"شکل و صورت کیسی ہے؟"

"کچھ کچھ ان بھائی صاحب سے ملتی جلتی ہے" اس نے عطا کی طرف اشارہ کر کے کہا۔

ایک دن عطا اور ہم پپلاں کے ریلوے اسٹیشن سے گاڑی میں سوار ہوئے۔ گاڑی میں اتنا ہجوم تھا کہ بصد مشکل کھڑے ہونے کی جگہ مل سکی۔ گاڑی روانہ ہو رہی تھی کہ دو حضرات ہارمونیم اور طبلہ اٹھائے ہمارے کمپارٹمنٹ میں داخل ہوئے۔ ہارمونیم اور طبلہ دیکھ کر لوگ ان کی طرف متوجہ ہوئے۔ تو ہارمونیم والے صاحب نے تقریر شروع کی۔

" صاحبان، مہربان، قدر دان۔ موسیقی کے فن میں مہارت کے دعوے دار تو ہر جگہ موجود ہیں۔ مگر دعویٰ وہ سچا جو میدان میں ثابت کر کے دکھا دیا جائے۔ تو صاحبان، مہربان، قدر دان ہمارا دعویٰ یہ ہے کہ آپ کوئی بھی فرمائش کریں، گیت، غزل، ٹھمری، کچا راگ، پکا راگ، قوالی، ڈوھڑہ، ماہیا ہم آپ کی فرمائش اس طرح پوری کر کے دکھا دیں گے کہ ہماری مہارت پر آپ عش عش کر اٹھیں گے۔"

اس تقریر کے بعد ان فن کاروں نے فن کا مظاہرہ شروع کیا۔ کچھ فرمائشی، کچھ اپنی پسند کی چیزیں سنائیں سامعین نے ایک ایک دو دو روپے کے نوٹوں سے ان کے فن کو خراج تحسین پیش کیا۔ حسب توفیق دو چار روپے ہم نے بھی نذر کیے۔

گاڑی اگلے سٹیشن پر رکی تو یہ محفل ختم ہوئی اور فن کار اپنا کام ختم کر کے رخصت ہونے لگے۔ ہم دروازے کے قریب کھڑے تھے۔ میں نے انہیں روک کر پہلے تو ان کے فن کی تعریف میں چند الفاظ کہے اور پھر بات کا رخ بدلتے ہوئے پوچھا۔

" استاد جی یہ بتائیے کہ آج کل جو لوگ شوقیہ گلوکاری کر رہے ہیں، آپ کی رائے میں ان میں سے سب سے بہتر کون گا رہا ہے؟"

" اللہ آپ کو سلامت رکھے سرکار، ہماری رائے میں تو وہ لڑکا ہے نا عطاء اللہ خان عیسیٰ خیلوی، اس سے بہتر کوئی نہیں گا سکتا۔ بے پناہ درد بھرا ہے قدرت نے اس کی آواز

میں۔"

"عطاء اللہ خان کو کبھی دیکھا بھی ہے ؟" میں نے پوچھا۔

"جی سرکار' کندیاں میں ایک شادی کے موقع پر دور سے ایک نظر دیکھنے کا اتفاق ہوا تھا۔"

اور جب میں نے انہیں بتایا کہ میرے ساتھ کھڑے ہوئے صاحب عطاء اللہ خان عیسیٰ خیلوی ہیں' تو ہارمونیم اور طبلہ ایک طرف پھینک کر انہوں نے عطا کے پاؤں پکڑ لئے۔

"معاف کردو سرکار۔ ہمیں علم نہ تھا کہ آپ یہاں موجود ہیں۔ کہاں آپ اور کہاں ہم -- ہم تو آپ کی خاک پا ہیں سرکار -- ایک عرصہ سے آپ کی زیارت کی خواہش دل میں لئے بھرتے ہیں۔ ایک حقیر سی التجا ہے سرکار۔ فقیروں کی التجا رد نہ کیجئے گا (ہارمونیم عطا کی طرف بڑھاتے ہوئے) صرف ایک ڈوھڑہ ہو جائے سرکار --- خالی الاپ ہی سہی۔

عطا نے بڑے پیار سے انہیں سمجھایا کہ فی الحال ان کی فرمائش کی تکمیل ناممکن ہے۔ البتہ وہ جب چاہیں عیسیٰ خیل تشریف لے آئیں اور اس کے معزز مہمان بن کر جتنا عرصہ جی چاہے اُسے سنتے رہیں۔

ایک رات عطا رات گئے کندیاں سے واپس آ رہا تھا کہ پائی خیل کے قریب موٹر سائیکل کا ٹائر پنکچر ہو گیا اب اس کے سوا کوئی چارہ نہ تھا کہ وہ موٹر سائیکل کو کسی ٹرک یا ویگن پر لاد کر میانوالی لے جائے اور وہاں سے پنکچر کی مرمت کرا کے گھر کی راہ لے۔ چنانچہ وہ وہیں سڑک کے کنارے کھڑا ہو گیا اور ہر آتی جاتی گاڑی کو روکنے کی کوشش کرنے لگا۔ یکے بعد دیگرے تین ٹرک میانوالی جاتے ہوئے وہاں سے گزرے تینوں میں عطا کے کیسٹ بج رہے تھے مگر سڑک پر کھڑے ہاتھ ہلاتے نوجوان کو لفٹ دینے کی زحمت کسی بھی ڈرائیور نے گوارا نہ کی۔ انہیں کیا معلوم کہ جس آواز پر وہ سر دھنتے جا رہے ہیں' وہ آواز اسی نوجوان کی ہے۔

ماسٹر وزیر کے تعاقب میں

ہم سے دوستی کا کوئی اور فائدہ ہو نہ ہو' یہی کیا کم ہے کہ اس بہانے لوگ دنیا کا حسین ترین شہر (میرا شہر' داؤد خیل) دیکھ لیتے ہیں۔ عطا بھی کئی مرتبہ داؤد خیل آیا اور جہاں اس کی دلنواز شخصیت نے لوگوں کے دلوں پر جاوداں نقش مرتب کئے' وہاں بعض لوگوں کی محبت نے عطا کے دل میں بھی امریادوں کے چراغ ضرور روشن کئے۔

داؤد خیل میں عطا کی آمدورفت کی پوری تفصیل تو بہت طویل ہو جائے گی۔ البتہ ایک واقعے کا ذکر ضروری سمجھتا ہوں۔

ہوا یہ کہ ایک دفعہ گرمیوں کی چھٹیوں میں ماسٹر وزیر ہم سے ملنے داؤد خیل آئے تو پھرتے پھراتے چند اور احباب سے بھی ان کا تعارف ہو گیا۔ میرے ایک دوست ندیم صاحب کی باغ و بہار شخصیت ماسٹر صاحب کو کچھ ایسی بھا گئی کہ ہر دوسرے تیسرے دن باقاعدگی سے داؤد خیل آنا جانا شروع کر دیا۔ ندیم صاحب کے ہاں ہر وقت ہر عمر اور ہر قبیل کے احباب کا مجمع لگا رہتا ہے اس لئے ہر آدمی کو اپنی پسند کا آدمی با آسانی مل جاتا ہے۔ ہوا ماسٹر صاحب کے ساتھ بھی یہی، مگر وہ ایک عرصہ تک ہم سے چھپاتے رہے۔ عیسیٰ خیل کے احباب پوچھتے تو ماسٹر صاحب کا جواب یہ ہوتا کہ "یار" لالا منور کی شخصیت دل و دماغ پر کچھ ایسی چھائی ہے کہ اسے دیکھے بغیر چین نہیں آتا۔ بس اسی لئے ہر دوسرے تیسرے دن داؤد خیل جانا پڑتا ہے۔ مجھ سے کہتے "لالا" آپ کے دوست ندیم صاحب نے تو مجھ پر ایک جادو سا کر دیا کہ دو دن بھی اس کے بغیر رہا نہیں جاتا۔ حقیقت حال یہ تھی کہ توجہ کا مرکز نہ یہ فقیر تھا، نہ ندیم، انکشاف اس حقیقت حال کا عطا کے ہاتھوں ہوا اور وہ اس طرح۔

ماسٹر وزیر کی عیسیٰ خیل سے اکثر و بیشتر غیر حاضری عطا جیسے مزاج شناس کیلئے خاصی معنی خیز ثابت ہوئی۔ اس غیر حاضری کی جو وجہ ماسٹر صاحب بتاتے تھے وہ عطا کی نظر میں عذر گناہ بدتر از گناہ سے کم نہ تھی۔ چنانچہ اس نے سراغ رسانی کا ایک جامع منصوبہ فی الفور مرتب کر لیا۔

اس اثنا میں ایک دن مجھے عیسیٰ خیل جانے کا اتفاق ہوا تو عطا نے ماسٹر صاحب کی مصروفیات کے بارے میں پوچھا میں نے بتایا کہ میرے علم کے مطابق تو ان کا زیادہ تر وقت ندیم صاحب کے ہاں بسر ہوتا ہے۔

"کتنی عمر کے ہیں یہ ندیم صاحب؟" عطا نے مسکرا کر کہا۔

"تیس پینتیس برس سے کم کے تو نہیں ہوں گے۔" میں نے جواب دیا۔

"اچھا، تو پھر بات کوئی اور ہے، عطا نے ایک گہرا سانس لے کر کہا

اگلے دن دوپہر کو ندیم صاحب کے ہاں ماسٹر وزیر، یہ فقیر اور چند دوسرے لوگ جمع تھے۔

ماسٹر صاحب حسب معمول اپنی دلچسپ باتوں کے سبب میر محفل بنے ہوئے تھے۔ باتوں باتوں میں کسی دوست نے کہا

"ماسٹر صاحب، عطاءاللہ خان کا آپ کا چولی دامن کا ساتھ ہے۔ لہٰذا موسیقی میں کچھ نہ

کچھ دسترس تو آپ کو بھی ضرور ہو گی۔"

"کچھ زیادہ تو نہیں" ماسٹر صاحب نے کسر نفسی کے انداز میں کہا "بس کبھی کبھی عطا کسی مشکل دھن پر گرفت حاصل نہ کر سکے تو اس کی تھوڑی بہت رہنمائی کر دیتا ہوں۔"

"واہ صاحب" ندیم صاحب نے کہا "پھر تو آپ کا شمار یقیناً موسیقی کے ماہرین میں ہونا چاہیے۔" "اور آج یہ بات منظر عام پر آ ہی گئی ہے تو ہو جائے کچھ نہ کچھ۔ بس ایک آدھ گیت ہی سہی"۔

"وہ تو ٹھیک ہے" ماسٹر صاحب نے بڑے رعب سے کہا "مگر ہارمونیم کے بغیر کبھی گاتا نہیں اب اول تو داؤد خیل میں ہارمونیم کہاں سے آئے گا۔ اور آ بھی جائے' تو اسے بجائے گا کون" کہ ہم بڑے فن کار خود تو ہارمونیم کو ہاتھ تک نہیں لگاتے۔"

"ہارمونیم بجانا ہمارے ذمہ" ہم نے لوگوں کو مرعوب کرنے کا یہ موقع مفت میں ہاتھ آتا دیکھ کر کہا۔ ہمیں یقین تھا کہ نہ تو من تیل ہو گا' نہ رادھا ناچے گی۔

برا ہو ذکی صاحب کا کہ وہ چند ہی منٹ میں کہیں سے ہارمونیم اٹھالائے۔ اب فرار کی کوئی راہ نہ ہمارے لئے تھی' نہ ماسٹر صاحب کیلئے ماسٹر صاحب نے کان پر ہاتھ رکھ کر اپنی ست رنگی آواز میں بھیرویں کا ڈوھڑہ شروع کیا اور ہم ہارومونیم پر ان کے تعاقب میں رواں ہوئے "ککڑا دھمی دیا والی دھن کے سوا کچھ بجانا آتا نہیں تھا لہٰذا اسی کو غنیمت سمجھا۔

ڈوھڑہ ختم کر کے ماسٹر صاحب نے گیت کے عنوان سے یہ غزل چھیڑی

بے وفا یوں ترا مسکرانا' بھول جانے کے قابل نہیں ہے

میں نے وہ زخم کھایا ہے دل پر جو دکھانے کے قابل نہیں ہے

پھانسی کے مستحق ہیں وہ سب سامعین جنہوں نے یہ سب کچھ نہ صرف گوارا کر لیا' بلکہ بے تحاشا داد بھی دیتے رہے۔ ہوتے ہوتے بات اس مصرعے تک پہنچی۔

ایسے عاشق کو سولی چڑھا دو رحم کھانے کے قابل نہیں ہے

جونہی ماسٹر صاحب نے یہ مصرعہ شروع کیا دروازہ کھلا اور عطا بڑے احترام سے اندر داخل ہوا' فن کاروں کو ایک فرشی سلام کر کے مؤدب ایک طرف بیٹھ گیا۔ فن کاروں کی حالت دیکھنے کے قابل تھی۔ ہمارے ہاتھ سے ہارمونیم کا پنکھا چھوٹا' ماسٹر صاحب کا الاپ ٹوٹا' اوپر کا سانس اوپر' نیچے کا نیچے' ہم قہر بار نگاہوں سے ماسٹر وزیر کو اور وہ عطا کو گھور رہے تھے۔ عطا نے ایک نظر سامعین پر ڈالی اور آنکھوں ہی آنکھوں میں ماسٹر صاحب کو مطلع کر دیا کہ داؤد خیل سے ان کی والہانہ وابستگی کا سبب اب مخفی نہیں رہا اور ساتھ ہی یہ بھی واضح کر دیا کہ بقیہ باتیں عیسیٰ خیل جا کر ہوں گی جن کے نتیجے میں یہ وابستگی اپنا توازن برقرار نہیں رکھ سکے

گی۔

پھر مجھ سے مخاطب ہو کر عطا نے بتایا کہ حال ہی میں اس نے گجرات کے ایک پنجابی شاعر مظہر صاحب کی ایک خوبصورت غزل منتخب کی ہے مجھ سے ہارمونیم لے کر اپنی گود میں رکھا اور دھیمی آواز میں یہ غزل اپنی بنائی ہوئی خوبصورت دھن میں سنائی۔ مطلع یہ تھا۔

آس دا کاسہ ہو گیا خالی صدقہ پیار کے دا

یہ غزل بعد میں عطا کے کیسٹ والیوم نمبر میں ریکارڈ ہوئی۔

بے قدراں دی یاری

میانوالی کی ادبی تاریخ میں سید انجم جعفری اپنی حب وطن سے لبریز شاعری کے علاوہ انجمن آرائی کے حوالے سے بھی ایک اہم حیثیت رکھتے ہیں۔ جس زمانے میں آپ گورنمنٹ مڈل سکول ماڑی انڈس میں ہیڈ ماسٹر تھے' وہاں بڑے بڑے عظیم الشان مشاعرے منعقد ہوئے۔ اسی سلسلے کا ایک مشاعرہ غالباً اکتوبر ۱۹۷۷ء میں ضلع کے ایک اعلیٰ افسر کی صدارت میں ہوا۔ اس مشاعرہ میں ضلع بھر کے معروف اہل قلم شریک ہوئے۔ مشاعرے کے انتظامات طے کرتے ہوئے میں نے جعفری بھائی کو بتایا کہ میرے ایک دوست عطاء اللہ خان عیسیٰ خیلوی بہت اچھا گاتے ہیں۔ کیوں نہ مشاعرے کے بعد ایک مختصر سی محفل موسیقی کی بھی منعقد کر لی جائے۔

جعفری بھائی فوراً رضامند ہو گئے اور ہم نے عطاء کو بھی اس تقریب میں شمولیت کی دعوت دے دی۔ محدود وسائل کے باعث چائے پانی کا بندوبست چونکہ صرف شعراء کیلئے مخصوص تھا اس لئے سامعین سے محفل موسیقی کی خبر مخفی رکھی گئی۔ طے یہ ہوا کہ مشاعرے کے بعد چائے پی جائے گی اور پھر بزم نغمہ برپا ہوگی۔

تقریبات کی صدارت افسروں سے کرانے میں ایک قباحت یہ ہوتی ہے کہ ہر کام ان کے بنے ہوئے شیڈول کے مطابق کرنا پڑتا ہے۔ مشاعروں جیسی تقریبات میں یہ لوگ ازراہ کرم آ بھی جاتے ہیں تو تقریب سے زیادہ فکر انہیں اپنی واپسی کی ہوتی ہے۔ چنانچہ ہم نے صدر محفل کو موسیقی کے پروگرام کے بارے میں بتایا تو کہنے لگے " دیکھیے میرے پاس وقت بالکل نہیں ہے۔ البتہ چائے پینے کے دوران آپ کے دوست سے ایک آدھ چیز سن لیں گے۔

میرا مقصد چونکہ دانشور طبقہ میں عطاء کو متعارف کرانا تھا اس لئے یہ ذلت آمیز

شرط بھی گوارا کرلی۔ سکول کے ایک کمرے میں چائے کا بندوبست تھا۔ چائے نوشی شروع ہوئی تو میں نے اعلان کیا کہ حضرات اب ایک ابھرتے ہوئے نوجوان فن کار عطاء اللہ خان عیسیٰ خیلوی آپ کو فیض صاحب کی ایک غزل سنائیں گے۔

حاضرین کی بے حسی پر آج بھی آٹھ آٹھ آنسو بہانے کو جی چاہتا ہے۔ عطاء نے غزل چھیڑی مگر وہ حضرات بدستور اپنی ادھر ادھر کی فضول باتوں میں مشغول رہے۔ کچھ بزرگ تو جناب صدر کے گرد گھیرا ڈالے حق خوشامد ادا کرتے رہے۔

"واہ صاحب، کیا غزل تھی آپ کی!"

"صاحب آپ جیسا ادب پرور افسر تو زندگی بھر نہیں دیکھا"

"خدا کرے آپ ہزاروں سال میانوالی میں رہیں۔"

"حضور آپ کا کلام سن کر تو اپنی تمام تر شاعری بالکل بکواس لگتی ہے۔"

کچھ حضرات اپنے مختلف کاموں کے بارے میں گزارشات اور درخواستیں پیش کرتے رہے۔

شاعر اور اہل علم و قلم کہلانے والے ان لوگوں کی فن سے یہ بے اعتنائی اور کلام فیض کی یہ بے حرمتی میرے لئے ایک نہایت تکلیف دہ تجربہ تھی۔ جی تو چاہا کہ منٹو مرحوم کا وہ فقرہ ان کے منہ پر دے ماروں جو منٹو نے ایک پبلشر سے کہا تھا۔

"سالے آج تم جن تحریروں کو بے کار کہہ کر ٹھکرا رہے ہو کل یہی دنیا کی عظیم ترین کہانیوں میں شمار ہوں گی۔"

اور دیکھنے والوں نے دیکھا کہ منٹو کا یہ دعویٰ سو فی صد درست ثابت ہوا۔ اس دن اگر میں ان اہل علم و دانش سے کہتا کہ ظالمو آج جس فن کار سے تم اس قدر بے اعتنائی برت رہے ہو، کل یہی فن کار اپنے وقت کا مقبول ترین گلوکار قرار پائے گا اور تم اس سے متعارف ہونے میں فخر محسوس کرو گے" تو بات سو فی صد درست نہ ہوتی؟

کچھ ایسی ہی سرد مہری کا مظاہرہ ریڈیو اور ٹیلی ویژن کے ارباب اختیار نے بھی کیا۔۔ جب عطاء ایک دور افتادہ علاقے کا ایک گمنام فنکار تھا، تو ایک دو مرتبہ اس نے ریڈیو اور ٹیلی ویژن کی معرفت متعارف ہونے کی کوشش کی، مگر کوئی مؤثر سفارش نہ ہونے کی وجہ سے ارباب بست و کشاد نے یہ عذر کرکے ٹال دیا کہ "صاحب" آپ کی آواز ہمارے حساس مائیکروفون قبول نہیں کرسکتے، لہٰذا ہم آپ کیلئے کچھ کرنے سے معذور ہیں۔

اللہ کے فضل سے جب یہی عطاء کیسٹوں کی وساطت سے عوام کے دلوں کی دھڑکن بن گیا تو ریڈیو اور ٹیلی ویژن کے حکام نے اسے گریڈ اے کا گلوکار قرار دے کر دھڑا

دھڑ پروگرام دینے شروع کر دیئے۔

گمنامی اور ناقدری دوراں کے تلخ دور سے ہر فن کار گزرتا ہے۔ منٹو کی مثال پہلے عرض کر چکا ہوں۔ ایک منٹو ہی کیا ہر بڑے فن کار کے ساتھ ابتدا میں یہی کچھ ہوتا رہا۔ **شکسپئر** کو جاہل اور سرپھرا کہا گیا۔ سب سے دلچسپ مثال ڈاکٹر سیموئیل **جانسن** کی ہے۔ موصوف جب انگریزی زبان کی لغت مرتب کر رہے تھے تو ناداری اور بے بسی کے عالم میں انہوں نے لارڈ **چسٹر فیلڈ** سے تعاون کی درخواست کی تھی۔ اور بین السطور یہ بھی کہہ دیا تھا کہ تعاون کے اعتراف میں لغت ان کے نام سے منسوب کی جائے گی۔ مگر ادھر سے ان گزارشات کا جواب تک نہ ملا۔

پھر جب ڈاکٹر سیموئیل جانسن کے ان تھک محنت سے یہ لغت مکمل ہو کر منظر عام پر آئی تو لارڈ **چسٹر فیلڈ** نے ڈاکٹر سیموئیل **جانسن** کے نام ایک خط میں اس لغت کی تعریفوں کے پل باندھ دیئے۔

اس خط کے جواب میں ان کا شکریہ ادا کرتے ہوئے ڈاکٹر **جانسن** نے لکھا کہ جناب عالی' آپ کی اس ذرہ نوازی کا بے حد ممنون ہوں' مگر یہ ذرہ نوازی اس وقت کچھ عجیب ہی لگ رہی ہے' جیسے 'ایک آدمی دریا میں ڈوب رہا ہو اور خود کو موت کے منہ سے بچانے کیلئے ہاتھ پاؤں مار رہا ہو اور آپ کنارے پر کھڑے تماشا دیکھتے رہیں' مگر جب وہ شخص اللہ کے کرم اور اپنی ہمت سے اپنی جان بچا کر دریا سے بارہ نکل آئے تو آپ اس پر داد و تحسین کی بارش کر دیں ---- یہ کہاں کا انصاف ہے۔ یہ کہاں کی غریب پروری ہے۔

لارڈ **چسٹر فیلڈ** جیسے کم خرچ بالا نشین مخیر حضرات کے اسمائے گرامی عطاء کی داستان میں بھی آتے ہیں' مگر عطاء ہر حال میں ان کا بھرم رکھنے پر بضد ہے۔ لہٰذا وہ اسمائے گرامی لکھنے کی اجازت نہیں۔

محفل مہنگی پڑی

عیسیٰ خیل میں اپنے قیام کے ابتدائی دنوں میں میں چند پروفیسر ساتھیوں کے ساتھ عطاء کے محلے میں کرائے کے مکان میں رہتا تھا۔ ہمارے ایک مقامی دوست کو گلوکاری کا چسکا لگا تو پروفیسر صاحبان نے اس کے ساتھ ایک شام منانے کا پروگرام بنایا اس تقریب میں مہمان خصوصی کے علاوہ محلے کے بعض احباب بھی مدعو تھے۔ میں چونکہ ادھر میزبانی کے فرائض میں الجھا ہوا تھا اس لئے اس رات میکدے میں حاضری نہ دے سکا۔

میکدے میں دس بجے تک میرا انتظار کرنے کے بعد یار لوگ عطاء کی قیادت میں میری خیریت دریافت کرنے مکان پر پہنچے تو دیکھا کہ یہاں ایک اور محفل موسیقی بپا ہے ۔ یہ لوگ اندر آ کر سامعین کی پچھلی صفوں میں چپ چاپ بیٹھ گئے۔

عطاء کو دیکھتے ہی طوطا چشم سامعین نے صاحب شام گلوکار سے آنکھیں پھیر لیں اور متفقہ طور پر یہ مطالبہ کرنے لگے کہ سنیں گے تو صرف عطاء کو' ورنہ کسی اور کو نہ سنیں گے نہ سننے کی اجازت دیں گے ۔ ادھر عطاء نے کچھ سنانے سے صاف انکار کر دیا ہمیں جلانے کیلئے یہ کہہ کر کہ جس گلوکار کی خاطر پروفیسر منور جیسے اہل ذوق و نظر لوگ آج یہاں پابند بیٹھے ہیں ' میری کیا مجال کہ اس گلوکار کے مقابلے کو میدان میں قدم دھر سکوں۔ احباب کا اصرار حد سے بڑھا تو ہم بھی لگے عطاء کی منت سماجت کرنے ' کہ لالا ' بس ایک گیت ۔ آپ کو ہمارے سر کی قسم .... ہماری دوستی کا واسطہ ' وغیرہ وغیرہ مگر عطا نے ایک نہ سنی اور اتنے نرم و نازک دل توڑ تاڑ کر اپنے احباب کے ہمراہ میکدے کو لوٹ گیا۔

سامعین کی طوطا چشمی سے دل برداشتہ ہو کر صاحب شام فن کار پہلے ہی رخصت ہو چکے تھے لہٰذا یہ محفل ہمارے لئے دو طرفہ بد مزگی کا ذریعہ بن گئی ۔ ادھر صاحب شام ناراض ' ادھر عطا سے رنجش۔

اگلی صبح عطاء سے شکوہ کیا تو کہنے لگا " منور بھائی زیادتی سراسر تمہاری ہے ۔ میرے ہوتے ہوئے تم نے کسی اور گلوکار کو اپنے ہاں بلایا کیوں تھا؟ اگر مقصد احباب کو محظوظ ہی کرنا تھا تو مجھے بلا لیا ہوتا ۔ میرے لئے یہ بات ناقابل برداشت ہے کہ موسیقی کی محفل تمہارے گھر پر ہو اور مجھے مدعو ہی نہ کیا جائے --- بات خاصی معقول تھی اس لئے ' ہم خاموش ہو گئے ' ورنہ گھر سے تو کیا کیا کچھ سوچ کر آئے تھے ۔

...شاعر بنا گیا مجھ کو

ماسٹر وزیر کے ہاں دوپہر کے کھانے کی دعوت تھی ۔ مہمان ہم ' عطا اور لالا شفا --- باتوں کے دوران عطا کہنے لگا " منور بھائی اردو شاعری تو تم بہت اچھی کر لیتے ہو ۔ آج میری خاطر ایک گیت پنجابی میں ہو جائے ---- کسی بھارتی فلم کا وہ گیت ہے نا

پنجرے کے پنچھی رے ' تیرا درد نہ جانے کوئی

اسی دھن میں ایک گیت پنجابی میں لکھ دو۔

عطا کی فرمائش کی تعمیل میں میں نے اسی شام گیت لکھ دیا ۔ بول تھے :

کملی دا ماہی وے دس کیہڑے پاسے جاواں

عطاء نے بڑی محنت اور محبت سے یہ گیت اسی شام سے باقاعدہ گانا شروع کردیا۔ اس گیت کے یہ دو بند عطاء نے خاص طور پر بہت پسند کئے۔

مار مکایا ظالم لوکاں
میں کھندے کھندے ہتھ روکاں
دل کردا اے چھوڑ کے تیرا شہر کتھے نس جاواں
دس کیہڑے پاسے جاواں

توں آکھیں تے اجے وی جیواں
جے آکھیں تے ہن مر جاواں
دس تاں سئی میں کتنے تائیں در در ٹھوکراں کھاواں
دس کیہڑے پاسے جاواں

جب کبھی بھی سنو گے گیت مرے

عطاء کی آواز میں میرے جو گیت اب تک منظر عام پر آچکے ہیں انہیں تین قسموں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ اول تو وہ گیت تھے جو میں نے کسی معروف فلمی دھن پر لکھے مثلاً:

کملی دا ماہی وے دس کیہڑے پاسے جاواں
اللہ ناں بھلاوے اے تاں ماہی والی ٹور اے

کچھ گیت بعض قدیم لوک گیتوں پر تضمین کی صورت میں ہیں، جیسے:

☆ ساوی مورا کین تے بوٹا کڈھ دے چولے تے
☆ چن کتھاں گزاری ائی رات وے
☆ چھلا پھل کریں اے
☆ سن جانی کتھے ونج توں وسیا ایں

☆ پھراں ڈھونڈیندی جوبن کالے والاں دا

☆ بے درد ڈھولا ایویں نئیں کریندا

بعض گیت خالصتاً طبع زاد ہیں، مثلاً

☆ سچی دس وے ڈھولا کل کیوں نئیں آیا

☆ رت ولی پھلواں دے جوڑے آ گئے

☆ بیٹھی دیوانی قبراں دے اوہلے

☆ نت دل کوں آہداہاں کل ماہی آسی

☆ اک خوبرو جوان جو گاؤں کا مر گیا (اردو قطعات اور سرائیکی ماہیے)

انگلینڈ پروگرام نمبر ۲ والے کیسٹ میں سچی کہانی کے عنوان سے چند ڈوھڑے اور ماہیے بھی ہیں۔ یہ منظوم داستان میں نے عطا ہی کی زندگی کے ایک سچے واقعے کو ذہن میں رکھ کر لکھی تھی۔ تفصیلات بتانا افشائے راز کے مترادف ہو گا۔ اس لئے یہ کہانی پھر سہی۔

ویسے میرے ہر گیت کے پس منظر میں کوئی نہ کوئی سچی یا طبع زاد کہانی ضرور موجود ہے، بعض گیتوں کا پس منظر واضح کرنے کیلئے ایک دفعہ میں نے ان گیتوں سے ایک المیہ کہانی مرتب کر کے ایک کیسٹ میں ریکارڈ بھی کی تھی۔ کہانی میری آواز مین تھی، گیت عطا کی آواز مین۔ افسوس کہ عطاء کے ایک کرم فرمانے وہ کیسٹ ہی غائب کر دیا۔

یوں تو میرے سب گیت کم و بیش مقبول ہوئے، مگر

سچی دس وے ڈھولا کل کیوں نئیں آیا

اور

چن کتھاں گذاری ایئی رات وے

کی مقبولیت نے عطا کو بھی حیران کر دیا۔

"سچی دس وے ڈھولا کل کیوں نئیں آیا" میں نے ۱۹۷۹ء میں لکھا۔ عطاء اس زمانے میں اسلام آباد میں مقیم تھا۔ ایک دفعہ عیسیٰ خیل آیا تو مجھ سے شکوہ کیا کہ اتنے عرصہ سے تم نے کچھ لکھ کر نہیں دیا۔ میں نے وعدہ کر لیا کہ شام تک کم از کم ایک گیت ضرور لکھ دوں گا۔ یہ وعدہ کر کے میں سیدھا حضرت عتیل عیسیٰ خیلوی کے ہاں آیا اور ان سے کہا، حضرت مجھے فی الفور ایک گیت لکھنے کا حکم ملا ہے۔ اس لئے آپ سے گذارش یہ ہے کہ چائے کی ایک تھرماس میرے سپرد کر کے یہاں سے چلتے بنیں، بلکہ دروازے کو باہر سے تالا لگاتے جائیں کہ آپ نہیں تو کوئی اور صاحب دماغ چاٹنے کو نہ آجائیں۔ اور کم از کم ایک گھنٹہ سے

پہلے ہرگز ہرگز واپس آنے کی جسارت نہ کریں' ورنہ .... وغیرہ وغیرہ
بھلا ہو عقیل صاحب کا کمال سعادت مندی سے انہوں نے یہ سب کچھ کیا۔ گیت تو آدھ گھنٹے میں مکمل ہو گیا۔ اپنی رضا کارانہ قید تنہائی کا باقی عرصہ ہم نے چائے پی پی کر پورا کیا۔ عطاء نے گیت دیکھا۔ بہت خوش ہوا اور فی الفور ہارمونیم لے کر دھن بنانے بیٹھ گیا۔ اتفاق سے حضرت ناطق بھی آ گئے۔ انہوں نے بھی گیت اور دھن دونوں کو بے حد پسند کیا۔ میں نے عطاء سے کہا کہ لالا اس گیت کے ساتھ کیسٹ پر میرا نام نہ لکھوانا کہ کہانی تمہاری ہے' میری نہیں۔ کہتے ہیں کہ لندن کی ایک محفل مشاعرہ میں فیض صاحب سے ان کی شہرہ آفاق نظم

مجھ سے پہلی سی محبت مرے محبوب نہ مانگ

سنانے کی فرمائش کی گئی تو فیض صاحب نے فرمایا "کون کہتا ہے کہ وہ میری نظم ہے۔ بھائی وہ تو ملکہ ترنم نورجہاں کی ہے جنہوں نے اسے گا کر اس کی قیمت ادا کر دی ہے۔ یہی بات میں اپنے اس گیت کے بارے میں بھی کہوں گا۔ کہ یہ گیت میرا نہیں' عطا کا ہے۔ جس نے یہ گیت گا کر اس کی قیمت ادا کر دی ہے۔

یہ گیت رحمت گراموفون کمپنی نے عطاء کے کیسٹوں کے پہلے سلسلے کے والیم ۱۶ میں ریکارڈ کیا۔ خوش قسمتی سے اس گیت کو سازو کی آرائش بخشی وزیر جیسے بلند پایہ موسیقار کے ہاتھوں ملی یوں اس کی اہمیت کچھ اور بھی سوا ہو گئی۔ ریکارڈنگ کے فوراً بعد عطا اس گیت کا ماسٹر کیسٹ لے کر میرے پاس داؤد خیل آیا۔ عید الفطر کا دن تھا' شام کا وقت۔
لالا اپنا گیت سنو گے؟ عطا نے مجھ سے گلے ملتے ہوئے کہا۔
اور پھر اس نے اپنی گاڑی میں نصب ریکارڈ پلیئر پر پہلی مرتبہ یہ گیت سنوایا۔ بخشی وزیر کی موسیقی نے گیت کو چار چاند لگا دیئے تھے۔ تقریبات میں آج تک عطاء سے یہ گیت ضرور سنا جاتا ہے۔ ایک آدھ مرتبہ لاہور جانے کا اتفاق ہوا تو وہاں کے احباب میں عطاء نے مجھے اسی گیت کے حوالے سے متعارف کرایا

اس گیت کا اثر دیکھنا ہو تو عطاء کا وہ وڈیو کیسٹ ملاحظہ کیجئے جو لوک ورثہ نے حال ہی میں ریکارڈ کیا ہے۔ مستنصر حسین تارڑ عطا کی اس محفل کے میزبان ہیں۔ اس محفل میں عطاء جب یہ گیت گا رہا ہوتا ہے تو اس مصرعے پر

بھوں ظلم کیتی ء چاچے دا جایا

صاحب نظر کیمرہ مین ایک چہرہ سامنے لاتا ہے۔ اس چہرے کی آنکھوں میں تیرتے ہوئے آنسو کسی کی داستان حیات کا ایک دردناک باب کھول کر سامنے رکھ دیتے ہیں۔

بہت عرصہ ہوا میں نے عطاء کا ایک منظوم تعارف بھی لکھا تھا۔ پوری نظم تو اب یاد نہیں۔ چند شعر ملاحظہ کیجئے۔

اک درد بھری چیخ ہوں ناکام دعا ہوں
اجڑے ہوئے ماضی کی پریشان صدا ہوں
نغموں میں سمویا ہے لہو اپنے جگر کا
گیتوں کے بہانے یہ لہو تھوک رہا ہوں
کچھ لوگ یہ کہتے ہیں عطاء خود کو سنبھالو
" وہ دشمن جاں ہے ' تو بھلا کیوں نہیں دیتے ؟ "
جینے کی ہوس اتنی کہاں ہے ' مرے دل میں
ظالم مجھے مرنے کی دعا کیوں نہیں دیتے

گلوکار کی حیثیت میں عطاء کی بے مثال مقبولیت کسی شاعر یا موسیقار کی مرہون منت نہیں۔ یہ اللہ کا احسان ہے اور اللہ کسی کو مقبولیت عطا کرنے کیلئے شاعروں اور موسیقاروں کا محتاج نہیں۔ وہ سب کچھ کر سکتا ہے۔ خود مسبب الاسباب ہے اس لئے ' اسے اسباب کا سہارا نہیں لینا پڑتا۔ وہ دینے پہ آتا ہے تو اتنا دیتا ہے اور اس طرح دیتا ہے کہ خود لینے والا حیران و ششدر رہ جاتا ہے۔ اور کوئی اپنی خوش نصیبی کے بارے میں زیادہ سے زیادہ بس اتنا کہہ سکتا ہے کہ

یہ تو کرم ہے ان کا وگرنہ
مجھ میں تو ایسی بات نہیں

عطاء کو اللہ نے جو کچھ دیا وہ سب کے سامنے ہے۔ اور یہ بھی سب کو معلوم ہے کہ اس کی شہرت ' مقبولیت (محبوبیت کہنا زیادہ مناسب ہو گا) اور عزت کسی انسان کی عطاء نہیں۔ وہ کسی کے کندھوں پر نہیں ' بلکہ اپنے پاؤں پر کھڑا ہے۔

عطاء کے ذکر میں ان شعراء کا تذکرہ ضروری سمجھتا ہوں جن کا کلام عطاء ایک عرصہ سے گا رہا ہے۔ کیوں کہ لوگ ان کے خوبصورت کلام سے متاثر ہو کر ان کے بارے میں بھی کچھ نہ کچھ جاننے کے مشتاق ہیں۔ پیر فرید فقیر جیسے امر شعراء کے بارے میں تو لوگ پہلے ہی بہت کچھ جانتے ہیں۔ یہاں ذکر ان شعراء کا مقصود ہے ' جن کا کلام تو عطاء کی معرفت عالمگیر شہرت پا چکا ' مگر ان کی ذات تا حال محتاج تعارف ہے۔

یونس خان نیازی (مرحوم)

یونس خان مرحوم عیسیٰ خیل کے پٹھان قبیلہ خانی خیل کے چشم و چراغ تھے۔ آج سے ۲۵ سال قبل تقریباً ۹۰ برس کی عمر میں وفات پائی۔ کہتے ہیں کہ یونس خان کی شاعری کا محرک ایک المناک واقعہ ہوا۔ وہ یوں کہ آغاز شباب میں یونس خان کسی کے دام محبت میں گرفتار ہوئے۔ عاشق اور محبوب دونوں نے قرآن پاک پر ہاتھ رکھ کر قسم کھائی کہ ایک دوسرے کے سوا کسی سے شادی نہیں کریں گے۔ شومئی قسمت سے محبوب نے حالات سے ہار مان کر کسی اور سے شادی کرلی، مگر یونس خان زندگی بھر اپنے حلف پر قائم رہے، اور ۹۰ سال کی عمر تنہا ہی بسر کردی۔

کیا درویش صفت انسان تھا۔ اتنی لمبی عمر اکیلے گزارنا گوارا کرلیا، مگر قسم توڑنے کا گناہ گوارا نہ کرسکا۔ ایک ہم ہیں کہ بیسیوں قسمیں توڑ کر شرمندہ تک نہیں ہوتے۔ اور پھر بھی خود کو خوددار، باضمیر اور کیا کیا کچھ کہتے نہیں تھکتے۔

عیسیٰ خیل کے عمر رسیدہ لوگ بتاتے ہیں کہ یونس خان صبح سویرے گھر سے نکلتے اور دن بھر دریا کے کنارے کھجوروں کے جھنڈ میں بیٹھے فکر سخن میں مستغرق رہتے۔ شعر کہنے کی صلاحیت خداداد تھی۔ پڑھنے لکھنے سے نابلد تھے، مگر اپنے کلام کی حد تک پڑھنا لکھنا سیکھ لیا اور دو غیر مطبوعہ دیوان اپنی یادوں کو ہمیشہ زندہ رکھنے کیلئے چھوڑ گئے۔ تمام تر شاعری اپنی مقامی زبان میں کی۔ ہجر اور شکوہ کے مضامین مقامی اصناف سخن (ڈوہڑہ، ماہی اور گیت) کی شکل میں نہایت مؤثر طور پر نظم کئے۔ یونس کے سادہ لفظوں میں کس قدر بے پناہ درد ہے۔

کرسیں یاد کڈاہیں میکوں پیا مرداہاں جان جلا کے
تڑف تڑف میڈی جند پئی نکلے ماہی نام تمہاڈا چا چا کے
رب دے واسطے دلبر سوہنڑاں سبھالیں لاش میڈی کوں آ کے
سوہنڑیں ہتھاں نال یونس کوں رکھیں قبر دے وچ توں لہا کے

مجبور عیسیٰ خیلوی

سانولی رنگت، متبسم چہرہ، آنکھوں میں ایک پراسراری چمک، ریلوے میں ٹکٹ چیکر تھے۔ اب ملازمت سے سبکدوش ہو کر گوشہ نشینی کے مزے لوٹ رہے ہیں غلام حسین مجبور عیسیٰ خیلوی کا تعلق عیسیٰ خیل کے نواحی گاؤں شیخ محمود والا سے ہے۔ آپ

ریلوے میں ملازم ہیں۔ لکھنے کی ابتدا اردو میں کی اور تیس پینتیس برس پہلے بعض معروف جرائد میں ان کی نظمیں شائع بھی ہوتی رہیں۔ طبیعت لوک رنگ کی طرف مائل ہوئی تو اردو میں لکھنا ترک کر کے مستقل طور پر مقامی زبان میں لکھنے لگے۔ مجبور کے گیتوں میں بے پناہ ترنم ہے۔ لوک دھنوں کا جو ذخیرہ مجبور کے پاس ہے کہیں اور دیکھنے سننے میں نہیں آیا۔ گیت کے علاوہ ٹپہ بھی بہت خوبصورت لکھتے ہیں۔ عطاء نے سب سے زیادہ انہی کا کلام گایا ہے۔ ان کے تمام گیت مشہور و مقبول ہوئے۔ بالخصوص یہ گیت تو ہمیشہ زبان زد عام رہیں گے۔

☆ آوسیاں ساونیاں

☆ تیڈی دید نوں ترس گئیاں۔ وے پھٹی نوکریاں

☆ بودی چھنگاڑ نگ ڑنگ

☆ ڈھولا ملے نہ ونج وے

☆ لائی تیئں مندری میری چھلاں دے نال وئی وئی

☆ پخیر راغلے

☆ کوئی ڈھولے کوں سمجھاوے

اظہر نیازی

وضع قطع صوفیانہ، صحت قابل رشک، موم جیسا نرم دل محبت اور نفرت دونوں کی حدت سے ایک پل میں پگھل جاتا ہے۔

اظہر نیازی قمر مشانی، تحصیل عیسیٰ خیل کے ایک معزز پٹھان گھرانے کے چشم و چراغ ہیں، قمر مشانی کے لاری اڈہ پر داتا جنرل سٹور محض ان کا ذریعہ معاش ہی نہیں ان کے چاہنے والوں کے روزانہ سفر کی منزل بھی ہے۔

اظہر نیازی نہایت خوبصورت گیت لکھتے ہیں۔ قمر مشانی کے ایک نہایت سریلے فنکار عطاء زرگر مرحوم کی آواز میں ان کا گیت

راہند ایں توں کیوں غیراں نال ماہی وے

ان کا تعارف بنا۔ عطاء عیسیٰ خیلوی نے ان کے بہت سے گیت میکدے کی

محفلوں میں ریکارڈ کئے۔ ٹیلی ویژن پر عطاء نے پہلی بار اظہر نیازی ہی کا گیت

بے پرواہ ' ڈھولا کیوں ڈتا ایئی ساکوں رول

پیش کیا۔

خورشید عباس شاہ

شکل و صورت اور عادات و اطوار قلندرانہ ' دراز قامت ' وجیہہ نوجوان ' آنکھوں میں ایک مخمور سی اداسی۔ ڈھیرامید علی شاہ کے خاندان سادات سے تعلق رکھتے ہیں۔ عطاء کے استاد محترم ناصرالدین بخاری مرحوم کے قریبی عزیز ہیں۔

عطاء کے کیسٹ والیوم نمبر ۱۴ میں خورشید شاہ کے ڈوھڑے بے حد مقبول ہوئے خورشید شاہ ہجر کے مضامین نہایت مؤثر انداز میں نظم کرتے ہیں۔ ایک ڈوھڑہ ملاحظہ کیجئے۔

تساں کنڈ کیتی میتھوں سنگتی **بچھڑن** دس کتھ گیا **تیڈا سائیں**

کیہڑے منہ نال آکھاں رس گیا اے ' تنگ کردن **شام صباحیں**

کر سرنیواں ودا وقت نبھینداں ' او تاں نت آ **لیندن بھائیں**

جتھے خوش وسدا ایں خورشید کوں چن ہن گھن ونج آپ **اتھائیں**

ناطق نیازی

صوفی منش ' کم گو ' مگر بات کریں تو منہ سے پھول جھڑتے ہیں۔ سراپا خلوص ' طبیعت نہایت حساس ' عیسیٰ خیل کے پٹھان قبیلہ سرور خیل سے تعلق رکھتے ہیں۔ المیہ مضامین ڈوھڑے میں نہایت خوبصورتی سے نظم کرتے ہیں۔

دو دل ٹٹ گئے ' لٹ چمن گیا ' ھک کوک معشوق دی آئی

کتھے یار گئیوں میں کملی دا میں پھر دی آں وانگ سودائی

ھک پل وی چین نہ آوے میکوں ' وسے بند بند دے وچ ماہی

ناطق دنیا ظلم کیتا اے میڈا سجن تاں ایویں ناہی

فاروق روکھڑی

عمر ساٹھ کے لگ بھگ ' قدو قامت متناسب ' صحتمند تمتماتا چہرہ ' لباس درویشانہ

سادگی کا نمونہ ' انداز گفتگو نہایت بے تکلف ' مترنم آواز ' اور باغیانہ لہجہ کی وجہ سے مشاعروں کے کامیاب ترین شاعر۔

فاروق روکھڑی کی مشاعری کی اہمیت اپنی جگہ ' مگر میرے دل میں ان کیلئے بے پناہ احترام اور محبت کی ایک وجہ اور بھی ہے ' وہ یہ کہ میرے والد محترم نے اپنی وفات سے صرف دو دن پہلے مجھ سے پوچھا تھا۔

"یہ فاروق روکھڑی کون ہے ؟"

"شاعر ہیں۔" میں نے جواب دیا۔ "میرے بہترین دوست بھی ہیں۔"

"بہت اچھا لکھتا ہے۔" والدِ محترم نے فرمایا۔ "تمہارے دوست عطا نے اس کا وہ گیت گایا ہے نا :

کنڈیاں تے ٹر کے آئے تیڈے کولوں پیرو وانے
اگے تیڈی مرضی ڈھولن توں جانے یا نہ جانے

یہ گیت مجھے بے حد پسند ہے۔"

میں یہ سن کر حیران رہ گیا۔ زندگی میں میں نے کبھی والد محترم کو ریڈیو ' ٹیلی ویژن یا ٹیپ ریکارڈ پر گانا سنتے نہیں دیکھا۔ تاہم گھر میں ہم لوگ عطا کے کیسٹ اکثر سنتے رہتے تھے۔ یوں کئی گیت غیر ارادی طور پر انہوں نے بھی سنے ہوں گے۔ مگر پسند آیا تو فاروق روکھڑی کا گیت۔ یہاں یہ عرض کرنا بے محل نہ ہوگا کہ والد محترم گورنمنٹ کالج لاہور کے تعلیم یافتہ تھے اور شعر کا نہایت اعلیٰ ذوق رکھتے تھے۔

مسعود ملک کی آواز میں ٹیلی ویژن پر فاروق روکھڑی کی غزل

ہم تم ہوں گے ' بادل ہوگا
رقص میں سارا جنگل ہوگا

تو آپ نے بارہا سنی ہوگی۔ عطا کی آواز میں جناب فاروق روکھڑی کے بے شمار گیت اور غزلیں مختلف کیسٹوں میں منظر عام پر آچکی ہیں۔ خاص طور مندرجہ ذیل گیتوں کے بے حد مقبولیت حاصل ہوئی۔

☆ کنڈیاں تے ٹر کے آئے تیڈے کولوں پیرو وانے
☆ سوہنیاں دی خیر منگدے
☆ تیڈے در تے آن کھلوتی
☆ سانول نئیں آیا
☆ پچھیا کر ساڈا حال وے ڈھولا کدی کدی

- ☆ کل اساں ٹرونجنڑاں
- ☆ ایہو جیا رنگ بھر بولے تصویر دے
- ☆ جنون کو ضبط سکھالوں تو پھر چلے جانا
- ☆ یہ بات الگ تم سے جدا ہو

ملک آڈھا خان

ملک آڈھا خان نطقال قائد آباد ضلع خوشاب کے ایک زمیندار گھرانے سے تعلق رکھتے ہیں ڈوھڑہ لکھنے میں خاص مہارت رکھتے ہیں۔ توصیف جمال سے لے کر عالم نزع تک کے مضامین میں سینکڑوں ڈوھڑے لکھ چکے ہیں۔ لفظوں کی نشت و برخاست کا سلیقہ ان کے کلام کی امتیازی خصوصیت ہے۔۔

سونا خان بے وس

سونا خان بے وس کا تعلق ولیوالا' ضلع بھکر سے ہے۔ ڈوھڑہ اور گیت دونوں اصناف میں طبع آزمائی کرتے ہیں۔ عطا کی آواز میں ان کے درج ذیل گیتوں نے بہت شہرت پائی ہے۔

- ☆ بہوں تڑپایا ای ڈھول نادا ناں
- ☆ اللہ دی امان ہووی
- ☆ قسمت چنگی جو ناھی
- ☆ ڈیکھو عروج والو میڈا زوال ڈیکھو
- ☆ تیکوں اپنا عہد وفا یاد ھوسی
- ☆ دلاں دے تاجر او دنیا والو

بری نظامی

بری نظامی فیصل آباد میں رہتے ہیں۔ ان کا ہر گیت زباں زد خاص و عام ہوا۔ خصوصا

درج ذیل گیت بہت معروف ہیں۔

☆ عیسیٰ خیل دور تے نئیں
☆ نی مسیے جاگدی رہئیں
☆ تساکوں مان وطناں دا
☆ نال تہاڈے میں لالئیاں
☆ میرے ور گا دنیا دے وچ
☆ کھیڑے ھیر نوں ویاہ کے جدوں لے گئے

ماہیا

جذبات کے مؤثر اظہار میں ماہیا۔۔ اگر خالص ہو ۔۔۔ دنیا کی کسی بھی زبان کی شاعری سے کم تر نہیں۔ یہ بات ذہن میں رہے، کہ خالص ماہیا کسی پڑھے لکھے شاعر کی تخلیق نہیں ہوتا۔ یہ سراسر خداداد صلاحیت کی تخلیق ہوتا ہے اور وہ صلاحیت اللہ نے صرف اور صرف پنجاب کی ناخواندہ، مظلوم اور بے بس عورت کو عطا کی ہے۔ سماجی پابندیوں کی وجہ سے مشرقی عورت چونکہ کھل کر اپنے جذبات کا اظہار نہیں کر سکتی اس لئے ماہیا ہمیشہ Anonymous ہوتا ہے۔یعنی اس کی تخلیق کار کا نام کبھی منظر عام پر نہیں آتا۔ ھر نیا ماہیا پہلی بار شادی بیاہ کی تقریبات میں خواتین کی اجتماعی نغمہ سرائی کے دوران کسی بھولی بھالی شرمیلی سی دوشیزہ کی زبان سے دھیمے سروں میں منظر عام پر آتا ہے اور دیکھتے ہی دیکھتے زبان زد عام ہو جاتا ہے۔

ماہیے کے دلگداز اثر کو دیکھ کر بعض مرد شاعرون نے بھی ماہی الکھنا شروع کر دیا اور یوں سینکڑوں ماہیے دیکھنے سننے میں آنے لگے، مگر ماہی وں کے اس ہجوم میں بھی ان پڑھ پنجابی عورت کا تخلیق کیا ہوا خالص ماہیا کنکریوں کے ڈھیر میں پڑے ھیرے کی طرح چمکتا دمکتا صاف بہچانا جا سکتا ہے۔

ندیم صاحب کا مشہور شعر ہے۔

میں کھل کے رو نہ سکا جب تو یہ غزل کہہ لی
بچھڑ کے مجھ سے مگر تو نے کیا کیا ہو گا

گستاخی شمار نہ ہو تو ندیم صاحب کی خدمت میں دست بستہ عرض کروں گا کہ اگر "تو" سے مراد کوئی پنجابی دوشیزہ ہے، تو اس نے ہزار ہا غزلوں سے بہتر ایک ماہیا تخلیق کر کے

اپنے بے زبان جذبوں کو یقیناً جاوداں بنا دیا ہو گا۔ اور اس کے جذبات کے یہ بے ساختہ اظہار۔

گل ساڈھے اجڑن ڈی کدی ماہی وی سن باہسی

یا اس سے ملتے جلتے الفاظ میں کسی گلوکار کی زبان سے آپ بار ہا سن بھی چکے ہوں گے۔ یہ الگ بات کہ اس ماہیے پر رو دینے کے باوجود شاعرہ کا نام آپ کو آج تک معلوم نہ ہو سکا ہو۔

حیرت کی بات یہ ہے کہ ڈیڑھ مصرعے کے ماہیے میں مفہوم سارے کا سارا ایک ہی مصرعے میں سما جاتا ہے۔ اوپر کا آدھا مصرعہ تو صرف قافیہ بندی کیلئے ہوتا ہے اور ننانوے فی صد ماہیوں میں اس آدھے مصرعے کا مفہوم سے دور کا واسطہ بھی نہیں ہوتا۔ اس کے باوجود ایک ہی مصرعے میں بعض اوقات ایک مکمل افسانہ اپنے تمام تر لوازمات کے ساتھ بیان ہو جاتا ہے۔

یہ ماہیا دیکھیے:

رل کے میں انج مرساں ودے منیاں توں ناں پڑھ سو

(اے میرے محبوب میں تمہاری تلاش میں ماری ماری پھرتی ہوئی اس طرح گم ہو کر مروں گی کہ میری قبر کی تلاش میں تم قبروں کے سرہانے لگی تختیاں پڑھتے پھرو گے۔)

عطا کو اس جستجو میں کسی قبر کی تختی پر اس کا نام تو نہ مل سکا البتہ خالص ماہیوں کا ایک نادر و نایاب ذخیرہ ضرور ہاتھ آگیا۔ اس کے چند پسندیدہ ماہیے ملاحظہ کیجئے:

باغاں وچ امب جھلدے

سجن دانا ہوندے اساں در در کیوں رلدے

اڈدا کاں ویندا

سجن مرندے نے، تھی موت دا ناں ویندا

کاں اڈ گیا کاں کر کے

لوکاں ساکوں لٹ کھڑیا سجناں دا ناں کر کے

کوٹھے توں اڈ کانواں

پچھیں میڈے ماہیے توں میں جیواں کہ مرجاواں

سڑکی چوں راہ نکلے

قبر اچ جاہ رکھساں متاں ماہی وی آ نکلے

وکن املوک آیا

انج برباد کیتی ساکوں ویکھن لوک آیا

باغے وچ چڑھنی

حق ناہی ڈھولے دا' ساڈی عزت تباہ کرنی

کنڈا جریب ہوسی

پتلا ڈھولا اللہ جانے کہندے نصیب ہوسی

راہواں چہ پھل مکدے

سنبھل کے ٹر ڈھولا تیڈے قدماں دے مل چکدے

قطرے سے گہر ہونے تک

صحرا میں اک پھول کھلا

عیسیٰ خیل کے قبیلہ رب نواز خیل کے احمد خان نیازی کو اللہ تعالیٰ نے پہلے بیٹے سے نوازا۔ یہ بچہ دو بہنوں کے بعد پیدا ہوا' اس لئے اس کی پیدائش اس کے والدین کیلئے بے پناہ مسرت کا سبب ہوئی۔ والد نے اس کا نام عطاء اللہ خان رکھ کر اپنے اظہار تشکر کو مجسم کر دیا۔ قدرت کو شائد یہی انداز شکر اس قدر پسند آگیا کہ اس بچے کو غیر معمولی صلاحیتوں سے مالا مال کر دیا۔۔۔ جادو بھری پُرسوز آواز' دلکش شخصیت' عمدہ اخلاق اور پھر ان اوصاف سے پورا پورا فائدہ اٹھانے کی اہلیت۔ یہ آخری صفت قدرت کی سب سے اہم عنایت ہے۔ باکمال لوگوں اور عوام الناس میں فرق یہی صفت قائم کرتی ہے۔ ورنہ کچھ نہ کچھ خوبیاں تو ہر انسان میں ہوتی ہیں۔ بنانے والے نے کسی کو بھی یکسر محروم نہیں رکھا۔ مگر جن لوگوں کو اپنی خوبیوں سے پورا پورا فائدہ حاصل کرنے کی اہلیت عطا ہوئی وہی درجہ ء کمال کو پہنچے' اچھا لکھنے والے ہزاروں ہیں' مگر غالب' اقبال' اور فیض کی سی آفاقی شہرت' و مقبولیت کتنوں کے حصے میں آئی۔؟ اسی طرح گائیکی کے میدان میں سینکڑوں لوگوں نے نام پیدا کیا' مگر ملکہ ترنم نورجہاں' لتا منگیشکر' محمد رفیع' مہدی حسن' پٹھانے خان اور عطا اللہ عیسیٰ خیلوی کتنے ہیں؟

سید ناصر الدین بخاری مرحوم

ترنم اور پر سوز آواز قدرت کی دین ہے۔ ہوش سنبھالتے ہی عطا کو اس دین کا علم ہوا تو گانے کا شوق دل میں سما گیا۔ ابتدا میں یہ شوق مدرسہ میں حمد و نعت اور کلام اقبال سنا کر پورا ہوتا رہا۔ اساتذہ کی حوصلہ افزائی اور ساتھیوں کی داد و تحسین اس شوق میں برابر اضافہ کرتی رہی۔

عطاء ہائی سکول میں پہنچا تو خوش نصیبی سے اسے سید ناصر الدین مرحوم جیسا باکمال استاد نصیب ہوا۔ سید ناصر الدین مرحوم اس زمانے میں گورنمنٹ ہائی سکول عیسیٰ خیل میں انگریزی کے استاد تھے۔ قدرت نے انہیں بے شمار نادر و نایاب صفات سے نوازا تھا۔ حیرت انگیز علمی قابلیت اور پر کشش شخصیت کے علاوہ شستہ ادبی ذوق اور بلند آہنگ سریلی آواز نے انہیں ایک عجیب شان محبوبیت عطا کی تھی۔ ان کی نگاہ جو ہر شناس نے عطا میں ایک بلند پایہ فن کار کی خوبیاں دیکھ کر اسے اپنی خصوصی توجہ کا مرکز بنالیا۔ شاہ صاحب نے عطا کی حوصلہ افزائی ' سرپرستی اور تربیت کر کے اسے بہت جلد اس عظیم گلوکار سے متعارف کرا دیا جو عطا کے اندر تہذیب و تربیت کے مراحل طے کر رہا تھا۔ اور یوں عطا نے کم سنی ہی میں گلوکاری کو اپنا نصب العین بنالیا۔ استاد محترم نے اس کے طویل سفر کی راہ ہموار کی ' دور ' افق کے قریب منزل پر جگمگاتی شہرت ' عزت اور مقبولیت کی روشنیاں دکھائیں ' انگلی پکڑ کر چند قدم ساتھ چلے اور پھر لوٹ کر اپنے خالق حقیقی کے پاس چلے گئے۔
شاہ صاحب کی وفات کا سانحہ بالکل اچانک رونما ہوا۔ ابھی ان کی عمر ہی کیا تھی ۔۔ بمشکل پینتیس تیس سال جمعہ کی چھٹی اپنے بچوں کے ہمراہ گزارنے کیلئے جمعرات کی شام عیسیٰ خیل سے ڈھیر امید علی شاہ آئے۔ اپنے گھر کے صحن میں آرام سے سوئے ہوئے تھے کہ کسی نامعلوم قاتل نے صحن کی دیوار پر سے بندوق کا فائر کر کے چراغ زیست ایک ہی پھونک میں گل کر دیا۔

میں کس کے ہاتھ پہ اس کا لہو تلاش کروں ؟

حق مغفرت کرے عجب آزاد مرد تھا۔ شاہ صاحب بچپن میں میرے ہم درس رہے ' میٹرک کا امتحان ہم دونوں نے گورنمنٹ ہائی سکول داؤد خیل سے ایک ساتھ پاس کیا۔ شاہ صاحب جماعت میں اول رہے میں دوم۔ اول اور دوم کی یہ ترتیب پچھلی جماعتوں میں کئی دفعہ بدلی ۔ کبھی وہ اول آتے ' کبھی میں ' مگر میٹرک کے امتحان سے بہت پہلے شاہ صاحب نے اپنے اول آنے کا اعلان کر دیا تھا اور دن رات محنت کر کے اس اعلان کو سچا ثابت کر دیا ۔ محنت میں نے بھی بہت کی تھی ' مگر شاہ صاحب کی سی غیر معمولی ذہانت کہاں سے لاتا؟

شاہ صاحب کی ناگہاں وفات نے صرف ان کے بچوں ہی کو یتیم نہیں کیا، بلکہ ان سینکڑوں طلبہ کو بھی یتیم کر دیا جن کیلئے شاہ صاحب کی بے پناہ شفقت باپ کی محبت سے کسی طرح کم نہ تھی۔

عطا ان کا محبوب ترین شاگرد تھا اس لئے اس پر اس سانحے پر جو بیتی بیان سے باہر ہے۔ شفیق استاد کی ہدایت پر اس نے گلوکار بننے کا عزم تو پہلے ہی کر لیا تھا۔ اب اس عزم میں استاد محترم کی یاد کو زندہ رکھنے کا عزم بھی شامل ہو گیا۔ عطا آج بھی نہایت عقیدت 'احترام' محبت اور فخر سے شاہ صاحب کا نام لیتا ہے اور ان کا محبوب گیت:

کوئی مجھ سے پوچھے کہ تم میرے کیا ہو

گاتے ہوئے آج بھی اس کی آنکھیں بھیگ جاتی ہیں۔

شاہ صاحب کا اعجاز تربیت دیکھئے کہ عطا کی شخصیت میں شاہ صاحب کی شان دلربائی ہو بہو نظر آتی ہے میں نے دونوں کو بہت قریب سے دیکھا ہے اور کبھی کبھی عطا کے روپ میں سید ناصر الدین شاہ کو زندہ و سلامت اپنے سامنے پایا ہے۔ استاد محترم کی شخصیت کا اتنا گہرا اور دیرپا اثر ـــ سبحان اللہ'

سانول تیڈے رنگ وچ رنگی بیٹھی آں
ساری دنیا کولوں چنگی بیٹھی آں

عطاء کے معاشقوں کا شمار و حساب رکھنے والے احباب کی اطلاع کیلئے عرض ہے کہ استاد محترم سے محبت بھی عطاء کا ایک عشق تھا ـــ اور عشق بھی کامیاب۔

سحر ہونے تک

عطاء کے والد محترم کی قلندرانہ خودداری ایک ضرب المثل کی حیثیت رکھتی ہے۔ اسی خودداری کو سلامت رکھنے کے لئے انہوں نے خاندانی جاگیر سے دست بردار ہو کر گورنمنٹ ٹرانسپورٹ سروس کے شعبہ مالیات میں ملازمت کو ذریعہ معاش بنایا۔ ملازمت کا زیادہ عرصہ گوجرانوالہ میں اور کچھ عرصہ فیصل آباد میں بسر ہوا۔ ملازمت کی مدت پوری ہوئی۔ تو عیسیٰ خیل واپس آ گئے۔ پنشن وغیرہ کی صورت میں جو رقم ملی اس سے کپڑے کی تجارت شروع کی۔ دیہات میں کپڑے کا کاروبار زیادہ تر ادھار پر چلتا ہے۔ مفلس و نادار گاہک تن ڈھانپنے کو حسب ضرورت کپڑا ادھار تو لے جاتے ہیں مگر اس کی قیمت کی وصولی ایک ایسا طویل اور تکلیف دہ عمل بن جاتی ہے کہ باضمیر انسان اس کاروبار سے بہت

جلد بیکار ہو جاتا ہے۔ عطاء کے والد اس کاروبار سے عاجز آ گئے تو ایک ڈیزل انجن خرید کر لکڑی چیرنے کا آرا لگوا لیا۔ یہ کاروبار بھی راس نہ آیا تو آٹا پیسنے کی چکی لگوالی۔ سرمایا اتنا کم تھا کہ ملازم رکھنے کی استطاعت نہ تھی۔ اپنی صحت اتنی کمزور تھی کہ خود کام کرنے کی ہمت نہ تھی -- اس بے بسی کے عالم میں باہمت جوان بیٹا باپ کا سہارا بن گیا۔ اور عطاء کی خوبصورت انگلیاں آرے سے لکڑیاں چیرنے اور آٹے کی چکی چلانے کی مشقت میں ایک عرصہ تک جکڑا رہیں۔ مگر عطا اس مشقت کو اپنے لئے عین راحت و رحمت سمجھتا تھا کیونکہ اس مشقت کے صلے میں اسے دنیا کی سب سے بڑی نعمت -- باپ کی دعائیں --- ملتی تھیں۔

تنگ دستی کا یہ دور عطا کیلئے ایک ہمت شکن آزمائش کا دور تھا۔ اللہ کی عنایت نے آزمائش کے اس دور میں بھی اس کے اندر کے فن کار کو زندہ اور اس کے عزم کو جواں رکھا۔

عیسیٰ خیل جیسے دور افتادہ قصبے میں کوئی بھی کاروبار دو وقت کی روٹی سے زیادہ کچھ نہیں دے سکتا۔ آرا مشین اور آٹے کی چکی سے بھی گھر کی ضروریات پوری ہوتی نظر نہ آئیں تو عطا کے والد نے بچا کھچا سرمایہ لگا کر راشن ڈپو کا کاروبار شروع کیا' اور یوں ایک عرصہ تک یہی کاروبار ان کا واحد ذریعہ معاش رہا۔

تنگ دستی اور افلاس کے اس تکلیف دہ دور میں بھی عطا کی امی نے اپنے لخت جگر کو کسی قسم کے احساس محرومی سے دو چار نہ ہونے دیا۔ گھر کے خرچ میں سے کچھ نہ کچھ رقم بچا کر عطا کو بہترین لباس اور معقول جیب خرچ برابر مہیا کرتی رہیں۔ اس طرح لباس اور دوسری آسائشوں کے لحاظ سے عطا نے خود کو کبھی کسی سے کم تر نہ پایا۔ بلکہ اس کے ہم عمر نوجوان اس کی خوش حالی پر رشک کرتے تھے۔

ماں کی شفقتیں ہر مشکل میں عطا کی مشکل کشائی کرتی رہیں۔ خاندانی روایات سے آنکھ بچا کر عطا کے شوق گلوکاری کی حفاظت اور پرورش بھی ماں نے کی۔ عطا نے ہارمونیم خریدنے کی فرمائش کی تو اس کے والد اس پر برس پڑے۔

"گھر کا خرچ تو پورا ہوتا نہیں اور صاحبزادہ میراثیوں والے لوازمات خریدنا چاہتا ہے۔ میں ان عیاشیوں کیلئے ایک پیسہ بھی نہیں دے سکتا۔ خبردار جو آئندہ ہارمونیم کا نام بھی لیا"

"معافی چاہتا ہوں ابو۔ غلطی ہو گئی' عطا نے سر جھکا کر کہا۔

ابو تو یہ سن کر مطمئن ہو گئے' مگر امی کی غمگسار آنکھوں نے عطا کی آنکھوں میں تیرتے ہوئے آنسو دیکھ لئے تھوڑی دیر کے بعد ابو باہر گئے تو امی نے عطا کو سینے سے لگا کر گلو گیر آواز میں کہا۔

"دل چھوٹا نہ کر میرے لال۔ تیری فرمائش میں پوری کروں گی۔ تجھے ہارمونیم ضرور ملے گا۔"

"مگر وہ کیسے امی؟" عطا نے قمیض کے دامن سے آنسو پونچھتے ہوئے کہا۔ "ہارمونیم کے لئے رقم کہاں سے آئے گی۔ ابو ٹھیک ہی تو کہہ رہے تھے۔ ان کے پاس اتنی رقم کہاں ہے؟"

"تم فکر نہ کرو میرے لال۔ میرا زیور کس لئے رکھا ہے۔"۔

عطا نے اس پیش کش کی سختی سے مخالفت کی۔ مگر اس کے باوجود امی نے اگلے دن رقم زبردستی اس کے ہاتھ میں تھما دی۔

الصدف

والد کے کاروبار کی حالت کچھ بہتر ہوئی' تو عطا نے عیسیٰ خیل کے مین بازار میں الصدف کا نام کا ایک چھوٹا سا جنرل سٹور بنا لیا۔ یہ چھوٹا سا جنرل سٹور عطا کی سلیقہ شعاری' نفاست' اور شستہ ذوق کی جیتی جاگتی تصویر تھا۔ شوکیسوں اور شیلفوں کی آرائش' رنگ و روغن روشنی اور خوشبوؤں کی حسین آمیزش' شوکیسوں کے اندرونی جانب فیض' ندیم' ساحر اور ساغر صدیقی کے خوبصورت اشعار کے سٹیکر' اشعار کا انتخاب ہر ماہ نیا ہوتا۔

رات بھر کی شب بیداریوں کے باوجود عطا بلاناغہ ہر صبح سات بجے الصدف میں موجود ہوتا۔ صفائی اور جھاڑ پونچھ کا کام اپنے ہاتھ سے کرتا۔ اور پھر شام سات بجے تک اس قدر انہماک سے کاروبار میں مشغول رہتا' جیسے کاروبار کے سوا دنیا کا کوئی اور کام جانتا ہی نہ ہو۔ تاہم دائیں جانب کے شوکیس کے نیچے ایک دراز میں پڑے ٹیپ ریکارڈ پلیئر سے آتی ہوئی مدھم نغمہ سرا آواز اس ہمہ تن دکان دار کی شخصیت کے لطیف پہلو کا تعارف بھی کراتی رہتی۔ ٹیپ ریکارڈ پر مسلسل بجتے ہوئے اس کیسٹ کے ذریعے عطا اپنے رات بھر کے ریاض کا تنقیدی جائزہ لیتا رہتا۔ کیسٹ کو بار بار پلے (Play) کر کے وہ اپنی آواز ہارمونیم اور طبلے کی سنگت' اور گیت کے مجموعی تاثر میں اصلاح کے امکانات تلاش کرتا رہتا۔ اس سلسلے میں جو بھی نیا آئیڈیا ذہن میں آتا اگلی رات وہ ایک کیسٹ میں محفوظ کر لیتا۔ یوں ایک ایک گیت کو بیسیوں مرتبہ سن کر عطا اس پر اتنی محنت کرتا کہ اگلی مرتبہ وہ گیت ایک بالکل نئی چیز لگتا۔

الصدف جنرل سٹور پر گاہکوں کے علاوہ محفل شب کے بعض ساتھی بھی حاضری دیتے گفتگو کا موضوع نہ سیاست ہوتی' نہ موسیقی' بلکہ شہر کی نئی تازی خبریں' لطیفے اور

لطیف تر چھیڑ چھاڑ۔ خاص طور پر ماسٹر وزیر' شفاء اللہ ملک اور عطا کی نوک جھونک سننے کے قابل ہوتی ۔ دوستوں میں سے کوئی صاحب شفاء اللہ سے پوچھتے:

"لالا شفاء سنا ہے تمہارے ہاں کل کوئی مہمان تھا؟"

"اپنی ایسی قسمت کہاں لالا" شفا آہ بھر کر کہتا "مہمان میرا تھا' لے اڑے یہ دونوں بے غیرت۔"

"اپنی قسمت کو بدلنے کی کوشش کرو' یار۔" وہ صاحب کہتے۔

"عیسیٰ خیل میں تو ناممکن ہے لالا۔ کم از کم جب تک یہ دونوں (گالی) زندہ ہیں۔"

"تو عیسیٰ خیل چھوڑ کیوں نہیں دیتے؟"

"ان حرامیوں کے بغیر کہاں جی لگے گا لالا۔"

"ایک بات بتاؤ شفا" کوئی اور دوست چھیڑتا۔ "تمہارے سب کے سب مہمان بے وفا کیوں ہوتے ہیں؟"

"قصور ان بیچاروں کا نہیں ہوتا لالا" شفا ایک اور آہ بھر کر کہتا، "کمینوں کی صحبت انہیں بھی کمینہ بنا دیتی ہے۔"

"وفا تو اس دنیا سے بالکل اٹھ گئی ہے لالا۔" ماسٹر وزیر اپنی دانشمندی کا سکہ بٹھانے کی کوشش کرتے۔" اسی لئے تو میں نے یہ پکا فیصلہ کر لیا ہے کہ مر جاؤں گا مگر کسی سے دل نہیں لگاؤں گا۔"

"تم اپنی چونچ بند رکھو افلاطون کی اولاد" شفا کہتا "کون کھوتی کا پتر تم سے دل لگائے گا؟"

"دیکھو شفا' برداشت کی ایک حد ہوتی ہے۔"

"برا نہ مانو ماسٹر" عطا جلتی پر تیل ڈالتا "شفا ٹھیک ہی تو کہہ رہا ہے۔"

"اچھا' تو پھر میں جا رہا ہوں۔ غیرت نام کی کوئی چیز اگر مجھ میں ہے تو آئندہ تم لوگوں سے بات تک نہیں کروں گا" ۔۔۔۔ اور ماسٹر وزیر یہ اعلان کر کے دروازے کی طرف لپکتے۔ عطا دوڑ کر انہیں پکڑ لیتا اور منت سماجت شروع کر دیتا۔

"دفع کرو لالا ۔۔" شفا کہتا ۔۔۔ اور ماسٹر وزیر عطا سے ہاتھ چھڑا کر بھاگنے کی کوشش پھر سے شروع کر دیتے۔ عطا ان کے ہاتھ پر اپنی گرفت مضبوط کر کے شفا کو پانچ سات کراری گالیاں دیتا اور چند منٹ کیلئے دونوں محاذوں پر خاموشی چھا جاتی۔ اس قسم کے جذباتی منظر دن میں کئی بار دہرائے جاتے ۔۔

کیسے کیسے لوگ۔۔

الصدف جنرل سٹور پر عطا کے نت نئے شیدائی بھی نازل ہوتے رہتے۔ اس طرح عجیب و غریب شخصیات سے تعارف مفت میں ہو جاتا۔ "لالا عطا" بھکر سے آئے ہوئے ایک صاحب نے علیک سلیک کے بعد کہا "میں بہت دور سے آیا ہوں۔ میرا مسئلہ تم ہی حل کر سکتے ہو۔ بات یہ ہے کہ میرا محبوب آج کل سخت بے وفائی کر رہا ہے۔ اس لئے ایک ریل (کیسٹ) بھروانی ہے۔ سڑے بھنے ہوئے گانوں کی۔" وہ کر کر منتاں یار دیاں والا گیت ہونا چاہئے۔ اور "بے درداں دا کپتان ماہی والا" ڈوہڑہ بھی' اور وہ غزل ہے نا "دل لگایا تھا دل لگی کیلئے" وہ بھی۔۔۔ بس ایسی ریل ہو کہ اس یزید کی اولاد کا دماغ درست کر دے۔"

"دماغ درست کرنے کے لئے تو آپ کا جوتا زیادہ مناسب رہے گا لالا۔" شفا ہنس کر بولا۔ "اور ہاں 'یاد آیا" وہ صاحب شفا کی چوٹ کو نظر انداز کرتے ہوئے بولے "آخری بس چار بجے یہاں سے جاتی ہے۔ اور مجھے آج ہی واپس بھی ضرور جانا ہے۔ اس وقت۔۔۔ دو بج رہے ہیں۔۔۔ مہربانی کرو لالا۔۔ وقت بہت کم ہے۔"

ہم حیران کہ عطا ان صاحب سے کیوں کر نمٹے گا۔ مگر عطا نے نہایت سکون سے ان صاحب کی یہ تقریر سنی اور پھر نہایت مغموم صورت بنا کر کہنے لگا۔

"مجھے تم سے بہت ہمدردی ہے لالا۔ تم واقعی بہت دکھی معلوم ہوتے ہو۔ کاش میں تمہاری فرمائش پوری کر سکتا۔ دراصل بات یہ ہے کہ جس کی خاطر گانا شروع کیا تھا اسی نے منع کر دیا ہے۔ کہ خبردار جو آئندہ گانے کا نام بھی لیا۔ اب تم ہی بتاؤ میرے دوست۔"

"معافی چاہتا ہوں لالا۔" وہ صاحب ہاتھ جوڑ کر بولے "تم تو مجھ سے بھی زیادہ مظلوم ہو۔ گولی مارو میرے محبوب کو۔۔۔ وہ تو ہے ہی بے غیرت۔۔۔ اس کی خاطر تمہاری وسدی جھوک کیوں اجاڑ دوں؟ سچ پوچھو تو اس کی قیمت تو ایک کیسٹ کے برابر بھی نہیں۔"

اسی طرح ایک دن ایک اور صاحب الصدف جنرل سٹور پر وارد ہوئے اور فی الفور ایک کیسٹ ریکارڈ کروانے کا مطالبہ کیا تو عطا نے اپنے چھوٹے بھائی ثناء اللہ خان سے کہا:

"شنو! کدھر رکھا ہے وہ ایکس رے۔ ذرا لالا کو دکھاؤ نا۔"

ثناء اللہ ایکس رے لانے کے بہانے باہر چلا گیا تو عطا نے ایک درد بھری آہ بھر کر کہا" کیا بتاؤں لالا۔ کل ہی ایکس رے کروایا ہے۔ دو سوراخ دائیں پھیپھڑے میں ہیں' دو بائیں پھیپھڑے میں۔ ڈاکٹروں نے صاف صاف کہہ دیا ہے کہ اگر زندہ رہنا چاہتے ہو تو یہ گانے بجانے کا دھندا ہمیشہ کیلئے ختم کر دو۔ مجبوری ہے لالا ورنہ تمہاری فرمائش فوراً

پوری کر دیتا۔" یہ سن کر وہ صاحب سخت نادم ہوئے۔ کہنے لگے "میں شرمندہ ہوں لالا۔ مجھے تمہاری حالت کا علم نہ تھا۔ خدا تمہیں صحت کامل عطا فرمائے۔"

صوفی عمر خان

ایک دن روکھڑی کے علاقے سے عمر خان نامی ایک نوجوان آیا۔ قدو قامت اور صحت قابل رشک۔ چہرے پر معصوم سی داڑھی' باتوں میں عجیب بھولپن۔ کہنے لگا:
"تمہاری طرح میں بھی بہت دکھی ہوں لالا۔ کھیتی باڑی کا کام کرتا تھا۔ ایک بیل مر گیا' دوسرا ہل کا پھالا لگنے سے لنگڑا ہو گیا۔ پانچ سو روپے میں بڑی مشکل سے بیچا۔ میرے لئے اب دنیا میں کیا رہ گیا تھا۔ والدین اور بہن بھائی تو ہیں' مگر ان سے میری کبھی بنتی نہیں۔ بے حس لوگ ہیں سارے کے سارے اس لئے میں نے سوچا کہ تمہاری طرح میں بھی موسیقی کی ذریعے ساری دنیا کو اپنے دکھوں میں شریک کرلوں۔ لہٰذا آج سے تم میرے استاد' میں تمہارا شاگرد۔

صوفی عمر خان تقریباً ایک مہینہ عطا کے پاس مقیم رہا۔ موسیقی تو وہ بھولا بھالا انسان کیا سیکھتا' البتہ خدمت استاد میں اس نے کوئی کسر نہ چھوڑی۔ ان دنوں عیسیٰ خیل میں پانی کی قلت تھی۔ صبح سویرے عمر خان دو گھڑے سر پر اور ایک گھڑا بغل میں لے کر پانی لانے کے لئے دریا کی طرف روانہ ہوتا تو اس کی سادگی اور سعادت مندی دیکھ کر ہنسی بھی آتی اور رونے کو بھی جی چاہتا۔

کچھ عرصہ بعد عطا نے اسلام آباد میں سکونت اختیار کرلی تو صوفی عمر خان بھی ساتھ جانے کو تیار ہو گیا' مگر اچھا ہوا کہ اس کے گھر والوں کو عیسیٰ خیل میں اس کے ٹھکانے کا علم ہو گیا اور وہ آ کر بڑی منتوں خوشامدوں سے اسے منا کر واپس اپنے گھر لے گئے۔

چچا جان اور عطا کے احباب

جب کبھی عطا دکان کے لئے سامان خریدنے لاہور جاتا' یا کسی اور کام سے باہر جاتا تو جنرل سٹور کا کام اس کے والد محترم سنبھالتے۔ اور محفل شب کے بہت سے رفیقوں کی چھٹی ہو جاتی۔ شفا کی تو وہ صورت ہی دیکھنے سے بیزار تھے۔ ماسٹر وزیر ان کے سخت گیر ناصحانہ رویہ کی وجہ سے ان کے سامنے زیادہ دیر تک نہ ٹھہر سکتے۔ خدا جانے کیوں وہ ماسٹر

صاحب کی ہر بات کی مخالفت کرنا اپنا فرض سمجھتے تھے۔ اگر ماسٹر صاحب کہتے کہ آج موسم خوشگوار ہے تو چچا جان جھنجلا کر کہتے "تمہیں کیا پتہ اللہ کے کاموں کا۔ ہو سکتا ہے کہ چند منٹ کے بعد موسلا دھار بارش شروع ہو جائے۔ ایسی بے وقوفی کی باتیں نہ کیا کرو۔"

اگر ماسٹر صاحب کہتے کہ زمانہ بہت خراب ہو گیا ہے تو چچا جان فوراً ٹوکتے "زمانے کو برا نہ کہو ماسٹر۔ برے کو سب ہی برے نظر آتے ہیں۔ ساری دنیا کو اپنے جیسا نہ سمجھو۔"

اور اگر ماسٹر صاحب بے چارے زمانے کو اچھا کہتے تو چچا جان بھڑک اٹھتے۔

"تم کیا جانو ان باتوں کو۔ اتنا برا زمانہ تو کبھی آیا ہی نہیں۔ مگر تمہیں ان باتوں کا احساس کیوں ہونے لگا۔ جب تک باپ زندہ ہے عیاشی کئے جاؤ' بعد میں دیکھا جائے گا۔"

خدا کی مہربانی سے عطا کے دوستوں میں ایک میں ہی تھا جس کے ساتھ چچا جان کا رویہ ہمیشہ بے حد مشفقانہ رہا اور بحمد اللہ آج بھی ہے۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ میں نے آج تک چچا جان کی کسی بات کی تردید یا مخالفت کرنے کی جسارت نہیں کی۔ ایک وجہ یہ بھی ہو سکتی ہے کہ میرے نام کے ساتھ پروفیسر کا لقب منتھی ہونے کی وجہ سے وہ مجھے خاصا شریف اور معزز آدمی سمجھتے ہیں۔ بہرحال اللہ کا کرم ہے کہ آج تک وہ مجھے نہایت محبت اور قدر کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ اور چچا جان کے مزاج سے واقفیت رکھنے والے لوگ جانتے ہیں کہ یہ کوئی معمولی اعزاز نہیں۔

چچا جان کی اس خصوصی شفقت کی وجہ سے میں عطا کی عدم موجودگی میں بھی الصدف جنرل سٹور پر باقاعدگی سے حاضری دیتا۔ چچا جان بڑی محبت سے پیش آتے۔ میرے لئے چائے منگواتے۔ پھر تازہ اخبار کی روشنی میں ہم دونوں حالات حاضرہ پر تبصرہ کرتے۔ اور اس کے بعد شام تک کا بقیہ وقت عطا کے نالائق دوستوں کو کوسنے میں صرف کرتے۔ میں چچا جان کی اس رائے سے سو فیصد اتفاق کرتا کہ یہ سب کے سب لوگ ناکارہ اور اصلاح طلب ہیں۔

"کیا بتاؤں چچا جان" میں کہتا "اگر میرا بس چلے تو ان سب کو کچھ عرصہ کے لئے پاگل خانے میں داخل کرا دوں۔"

چچا جان میری اس دانش مندانہ بات پر اتنے خوش ہوتے کہ فوراً مزید چائے منگواتے۔ اور یوں یہ سلسلہ دن بھر جاری رہتا۔

عطا کے دوستوں سے چچا جان کی بیزاری کچھ ایسی بلاوجہ نہ تھی۔ دراصل چچا جان اس زمانے میں عطا کے مستقبل کے بارے میں بے حد فکر مند تھے۔ وہ چاہتے تھے کہ عطا عیسیٰ خیل کی افلاس زدہ فضا سے باہر نکل کر کوئی معقول اور باعزت ذریعہ معاش تلاش

کرے۔ مگر اس کے دوستوں کا اصرار اس بات پر تھا کہ عطا عیسیٰ خیل ہی میں رہے۔ اگرچہ چچا جان کی موجودگی میں تو ہم میں سے کوئی بھی یہ بات کہنے کی جسارت نہیں کر سکتا تھا مگر دل سے ہم سب یہی چاہتے تھے کہ عطا ہم سے کبھی جدا نہ ہو۔

عطا کے شوق گلوکاری کے بارے میں چچا جان کا رویہ شروع میں بہت سخت تھا۔ سرشام میکدہ میں احباب جمع ہوتے، محفل موسیقی کا آغاز ہوتا، مگر عشا کی اذان ہوتے ہی بتیاں بجھا کر سب لوگ ادھر ادھر ہو جاتے کیونکہ اس وقت چچا جان قریبی مسجد میں نماز پڑھنے کے لئے گھر سے نکلتے۔ اور اگر ہارمونیم کی آواز ان کے کان میں پڑ جاتی تو سب کی شامت آ جاتی۔ لہٰذا اذان کی آواز بلند ہوتے ہی میکدے میں بتیاں بجھا دی جاتیں۔ کوئی صاحب چارپائی کے نیچے پناہ لیتے، کچھ لوگ دیوار پھاند کر ادھر ادھر کی گلیوں میں بکھر جاتے۔ چچا جان میکدے کے دروازے پر آتے، دروازہ مقفل نہ پا کر غصے کا اظہار کرتے۔

" کم بخت دروازہ کھلا ہی چھوڑ جاتے ہیں "

دروازے کو باہر سے تالا لگاتے اور مسجد چلے جاتے۔

جب وہ نماز پڑھ کر واپس آتے اور گھر میں داخل ہو جاتے تو گلیوں میں بکھرے ہوئے احباب ڈرتے ڈرتے واپس آتے اور میکدے کے ساتھ والے کمرے کے دروازے پر آہستہ سے دستک دیتے۔ اندر پڑے ہوئے احباب میں سے کوئی صاحب اندر سے دروازہ کھولتے اور یوں آہستہ آہستہ سب لوگ دوبارہ جمع ہو جاتے اور محفل پھر سے جم جاتی۔

یہ معمول ایک عرصہ تک چلتا رہا۔ مگر عشق اور مشک کی طرح موسیقی بھی چھپنے چھپانے والی چیز نہیں۔ ان محفلوں کا علم چچا جان کو بھی بہت جلد ہو گیا۔ ایک آدھ مرتبہ انہوں نے احباب کو عین موقع پر پکڑ کر لعنت ملامت بھی کی۔ مگر نصیحت کا اثر نہ ہوتے دیکھا تو انہیں لاعلاج سمجھ کر نظر انداز کر دیا۔ اس کے باوجود ان کی ناراضگی کا خوف دلوں پر بدستور طاری رہا اور ہر شب عشاء کی اذان کے بعد ایک آدھ گھنٹہ کے لئے میکدے میں بتیاں تو نہ بجھائی جاتیں مگر سب احباب چپ چاپ 'باادب' باملاحظہ ہوشیار' سراپا شرافت بن کر بیٹھے رہتے۔ بعض اوقات آتے جاتے چچا جان میکدے کا دروازہ کھول کر حاضرین کو ایک نظر دیکھ بھی لیتے۔ دیکھنے کا مقصد یہ ہوتا کہ کہیں شفا تو اس محفل میں نہیں گھس آیا۔ مگر شفا بہت سمجھدار آدمی ہے۔ وہ ہمیشہ اس وقت آتا جب چچا جان اپنے بستر میں آرام سے سو رہے ہوتے۔

عطا کے احباب کا فرداً فرداً تعارف کرانے کے بجائے صرف یہی کہہ دینا کافی ہو گا کہ

۔ رانجھا ہر کیں دا سانجھا

اس کے احباب کی تعداد بلا مبالغہ اتنی بڑی ہے کہ ہر ایک کا تعارف فقط ایک فقرے میں کرایا جائے تو پھر بھی ایک اچھی خاصی ضخیم کتاب بن جائے۔ مگر میری مجبوری سمجھئے یا نالائقی کہ میرا تمام تر علم الاحباب اپنے ضلع کے ننھے سے دائرے میں محدود ہے اور عطا کی شناسائی بہار کی ہوا کی طرح پورے کرۂ ارض کا احاطہ کئے ہوئے ہے۔ ہوا کے تعاقب میں کوئی کہاں تک مارا مارا پھرتا رہے؟ اس لئے فی الحال تعارف صرف انہی احباب کا کرا سکتا ہوں جو میرے محدود علم کی دسترس میں ہیں۔

احباب میکدہ میں سے بیشتر لوگوں کا تو مفصل تعارف بر سبیل تذکرہ کہیں نہ کہیں ہو گیا۔ یہاں ذکر چند ایسے دوستوں کا ہو گا جو عطا کی میکدے سے باہر کی زندگی میں ہمدم و ہمراز رہے اور اب تک ہیں۔ عیسیٰ خیل میں عطا کے بعض احباب ایسے ہیں جو میکدے کے اندر اور باہر دونوں جگہ اس کے ساتھ رہے ---- ان میں سر فہرست نام اعجاز خان کا ہے۔ اعجاز خان عطا کے قریبی رشتہ دار اور تقریباً ہم عمر ہیں۔ نہایت خوبرو نوجوان ہیں اور اپنی خوبروئی سے پورا پورا فائدہ اٹھاتے ہیں۔ دل کے معاملات میں اکثر ملوث رہتے ہیں۔ ایسے معاملات میں عطا کے مشیر خصوصی یہی ہیں۔ لہٰذا جو رازہائے سربستہ ان کی تحویل میں ہیں کسی اور دوست کی دسترس میں نہیں۔

امتیاز خان ماشاء اللہ اب تو خاصے گرانڈیل نوجوان ہیں۔ میرے عیسیٰ خیل میں قیام کے زمانے میں بمشکل دس بارہ برس کے ہوں گے۔ عطا کے ماموں زاد اور نہایت لاڈلے بھائی ہیں۔ میکدے میں تو یہ اپنی کم سنی کے باعث رکنیت حاصل نہ کر سکے، مگر الصدف جنرل سٹور پہ دن بھر اپنے بڑے بھائی (عطا) کے گرد منڈلاتے رہتے تھے۔ عطا سے ان کی محبت عشق کی حد تک جب بھی تھی، اب بھی ہے۔

لالا فدا میکدے کے مستقل رکن ہیں۔ کم گو، مگر نہایت خوش اخلاق۔ تبسم کی ایک ہلکی سی دلنشین لکیر ان کے چہرے سے غائب ہوتی کبھی نہ دیکھی۔ لالا فدا میکدے کے ارکان میں سے واحد شخصیت ہیں جس کا دل ہمیشہ اس کے اپنے پہلو میں رہا۔ ایک دل کس کس کو دیں۔ ایک فدا اور اتنے محبوب۔ میکدے کے سب میخوار ان کے محبوب اور یہ ہر وقت ان کی خدمت پر کمربستہ۔

عتیل عیسیٰ خیلوی اپنی علم دوستی اور بلند پایہ ادبی ذوق کے باعث اہل میکدہ میں ایک اہم مقام رکھتے ہیں۔ امیر خسرو سے لے کر پروین شاکر تک نہ صرف ہر شاعر کا مکمل کلام، بلکہ ہر شاعر اور شاعرہ کے بارے میں آج تک جو کچھ لکھا گیا، ان کی ذاتی لائبریری کی

زینت ۔ اخباروں کے تراشے تک نہایت سلیقے سے محفوظ ۔ بیشتر کلاسیکی شعرا کے بارے میں ہماری معلومات ان کی ذاتی لائبریری کی مرہون منت ہیں ۔ نقوش ' ادب لطیف اور فنون جیسے مقتدر جرائد کے تمام خصوصی شمارے وہیں ہماری نظر سے گزرے ۔ ادب کے علاوہ دست شناسی پر بھی ہر قابل ذکر کتاب عتمل کی زنبیل میں موجود تھی مگر شکر ہے کہ ہم اس چسکے سے محفوظ رہے ورنہ کسی اور کام کے نہ رہتے ۔ عتمل سے ان کے اس ذوق کے بارے میں پوچھئے تو شرما کر کہتے ہیں :

؎ سیکھے ہیں مہ رخوں کے لئے دست شناسی

عتمل نہ صرف تین کتابوں (گل دشت ' رشتہ درد اور شہر سخن) کے مصنف ہیں ' بلکہ فن کتابت میں بھی خاصی دسترس رکھتے ہیں ۔ عطا کے نہایت بے تکلف دوست ہیں ۔ دونوں جب کبھی لہر میں ہوں تو ان کی نوک جھونک سننے کے قابل ہوتی ہے ۔ حضرت عتمل غصے میں ہوں تو خود کو ایسی ایسی چمکدار اور نادر و نایاب گالیاں دیتے ہیں کہ سامعین کے چودہ طبق روشن ہو جاتے ہیں ۔

خداداد خان ڈرائیور دن کو بس ڈرائیوری کرتے اور رات کا بیشتر حصہ میکدے میں گذارتے ۔ نہایت ہنس مکھ اور ملنسار آدمی تھے ۔ عرصہ ہوا تلاش معاش میں متحدہ عرب امارات گئے تھے ' جب تک میں عیسیٰ خیل میں رہا ' تب تک تو واپس نہیں آئے تھے ۔۔

ملازم حسین عرف ماجا ' عطا کے مستقل طبلہ نواز تھے ۔ گورنمنٹ ہائی سکول عیسیٰ خیل میں ملازم ہیں ۔ لوک گیتوں کے ساتھ سنگت میں ماجا کا سا منفرد انداز کم ہی سننے میں آتا ہے ۔ درویش صفت آدمی ہیں ۔ فن کا سچا ذوق رکھتے ہیں ۔

خدوزی تحصیل عیسیٰ خیل کے غلام دستگیر ہاشمی اور فاروق ہاشمی عطا کے قریب ترین ساتھیوں میں سے ہیں ---- فاروق ہاشمی (فاروق قریشی) کندیاں میں ٹھیکیداری کرتے ہیں اور مستقل طور پر وہیں مقیم ہیں ۔ عطا اکثر و بیشتر ان کے ہاں جاتا اور موسیقی کی محفلیں سجتیں ۔ عطا کی کندیاں آمدورفت اتنی زیادہ تھی کہ فاروق قریشی کی بیٹھک کو میکدے ہی کا ایک کمرہ کہنا بے جا نہ ہو گا ۔ خلوص اور محبت کی جو فراوانی دستگیر اور فاروق کے ہاں دیکھی کہیں اور شاید ہی دیکھنے کو ملے ۔ عطا اب بھی جب کبھی عیسیٰ خیل یا میانوالی آتا ہے تو لالا فاروق سے ملنے کندیاں ضرور جاتا ہے ۔

میانوالی کے عصمت گل عصمت خوبرو ' خوش اخلاق اور خوش سخن نوجوان ہیں ۔ شعر بہت عمدہ کہتے ہیں ۔ میانوالی میں عطا کا ایک ٹھکانہ عصمت کا دولت کدہ بھی ہے ۔ عصمت کی عطا سے محبت کا مرکز اس کے فن سے زیادہ اس کی دلاویز شخصیت ہے ----

عصمت کالج میں میرے شاگرد بھی رہے ہیں ۔۔ پچھلے سال انہوں نے عطا کے ساتھ شہزاد ہوٹل میانوالی میں ایک خوبصورت شام کا اہتمام کیا۔۔ اور یوں عطا کے بے شمار شیدائیوں کی دعائیں اپنے نامہ اعمال میں جلی سرخیوں میں درج کروائیں ۔ ایک موقع پر میرے اور عطا کے درمیان رنجش پیدا ہوئی تو عصمت کی بے تابی دیکھی نہ جاتی تھی ۔

ادب ' صحافت اور سیاست میں بیک وقت طبع آزمائی نے بھی محمد منصور آفاق کا کچھ نہیں بگاڑا ۔ مگر اس سے بھی بڑا کمال یہ ہے کہ منصور نے ادب ' صحافت اور سیاست کا کچھ نہیں بگاڑا حالانکہ وہ خاصا جذباتی اور جوشیلا نوجوان ہے اور کھڑکار پسند کرتا ہے ۔ مگر موثر کھڑکار کے لئے چونکہ وسائل چاہئیں جو بدقسمتی سے ہمارے ہاں مستحق لوگوں کی دسترس سے ہمیشہ باہر رہتے ہیں ' اس لئے منصور اپنی تمام تر صلاحیتوں کے باوجود ابھی تک دریافت نہیں ہو سکا ۔ موسیقی منصور کی کمزوری کبھی نہیں بن سکی ' مگر عطا کی شخصیت کے جادو سے یہ بھی نہ بچ سکا ۔

اقبال الدین شاہ ' جنہیں بعض دوست پیار سے بالا شاہ کہتے ہیں ' میانوالی کے ایک معزز گھرانے کے چشم و چراغ ہیں ۔۔۔ شاہ جی نہایت دلچسپ آدمی ہیں ۔۔ ہنسنے اور ہنسانے میں ان کا جواب نہیں ۔ عطا سے ان کے اکثر مکالمے نہایت چٹ پٹے ہوتے ہیں ۔ اتنے چٹ پٹے کہ لکھے بھی نہیں جا سکتے ۔ عطا سے ان کی دوستی ان دنوں سے ہے جب میکدہ آباد تھا ۔

اس زمانے کے بہت سے دوستوں کے نام اب یاد نہیں آ رہے ۔ ان سب سے معذرت خواہ ہوں اور یہ وعدہ کرتا ہوں کہ اس کوتاہی کی تلافی بہت جلد کر دوں گا ۔

سائیکل + اونٹ گاڑی = مزدا ۹۲۹

۱۹۶۸-۶۹ء میں جب پاکستان پیپلز پارٹی میدان عمل میں آئی تو پارٹی کے خوش آئند منشور نے متوسط طبقہ کے نوجوانوں کو فی الفور متوجہ کیا اور روٹی ' کپڑا اور مکان کے نعرے چار سو گونجنے لگے ۔

ضلع میانوالی میں پیپلز پارٹی کو حبیب اللہ خان آف دھلہ عظمت خان والا نے متعارف کروایا ۔ مرحوم حبیب اللہ خان کے بھٹو صاحب سے ذاتی مراسم تھے ۔ اور پارٹی کے لئے ان کی خدمات کے بھٹو صاحب بے حد معترف تھے ۔

میانوالی میں پارٹی کی مقبولیت بڑھتے بڑھتے عیسیٰ خیل تک پہنچی تو سب سے پہلے

عطا نے عیسیٰ خیل میں جئے بھٹو کا نعرہ بلند کیا۔ عطاء اللہ خان عیسیٰ خیلوی اس زمانے میں عطا شاہین کہلاتا تھا۔ عطا اللہ خان شاہین نے نوجوانوں کا ایک اچھا خاصا سرگرم گروہ منظم کر کے پارٹی کے حق میں رائے عامہ ہموار کرنے کا کام شروع کر دیا۔ پارٹی کے لئے اس کی خدمات کے صلے میں اسے پارٹی کی صوبائی قیادت کی طرف سے ایک عدد سہراب سائیکل عطا ہوئی' جو ایک عرصہ تک اس کی ہم سفر رہی۔

سہراب سائیکل سے مزدا۔ ۹۲۹ تک کا سفر عطا نے پیدل طے کیا۔ مگر کچھ اس تیزی سے طے کیا کہ دیکھنے والے حیران رہ گئے۔ کہاں وہ زمانہ کہ عطا کو کہیں جانا ہوتا تو موٹر سائیکل کی سواری کے لئے احباب کا مرہون منت ہونا پڑتا۔ اور کہاں یہ دور کہ صرف ایک کیسٹ ریکارڈ کرنے کے لئے کراچی کے ایک صاحب نے چمکتی دمکتی نئی ہنڈا اکارڈ کار عطا کی نذر کر دی۔

ناداری کے صبر آزما دور کا ایک دلچسپ واقعہ سنیے۔ ایک دفعہ عطا نے کسی نہایت ضروری کام کے سلسلے میں کندیاں جانا تھا تو ایک صاحب سے موٹر سائیکل منگوائی۔ موٹر سائیکل بھیجنے سے تو وہ صاحب انکار نہ کر سکے' مگر موٹر سائیکل کی ٹینکی سے پٹرول کا آخری قطرہ تک نچوڑ لیا۔ اس زمانے میں چونکہ عیسیٰ خیل میں کوئی پٹرول پمپ نہ تھا لہٰذا انہوں نے سوچا ہو گا کہ عطا چار و ناچار موٹر سائیکل جوں کی توں واپس بھیج دے گا۔ ادھر عطا کی مجبوری یہ تھی کہ اسے شام سے پہلے بہر حال منزل مقصود پر پہنچنا تھا۔ عطا کی جگہ کوئی اور ہوتا تو تھک ہار کر بیٹھ جاتا۔ مگر عطا کے ذہن رسا نے فی الفور ایک انوکھی ترکیب ڈھونڈ نکالی۔ عطا نے اپنے جنرل سٹور سے سگریٹ لائٹر آئل کی درجن بھر بوتلیں اٹھا کر موٹر سائیکل کی ٹینکی میں الٹ دیں اور موٹر سائیکل اسٹارٹ کر کے چلتا بنا۔

اپنی سواری نہ ہونے کے اس دور میں ایک دفعہ احباب میکدہ کو کلوانوالہ میں ایک دوست نے کھانے پر مدعو کیا۔ ہم لوگ پریشان تھے کہ سات آٹھ آدمیوں کا یہ قافلہ کلوانوالہ کس طرح پہنچے گا۔ عطا نے مسئلہ حل کر دیا۔ ایک دوست سے اونٹ گاڑی مانگ لایا۔ ہمیں اس پر بٹھایا' سٹیرنگ (اونٹ کی مہار) خود سنبھالی' اور نہایت چابکدستی سے ڈرائیونگ کرتا ہوا ہمیں کلوانوالہ لے گیا۔ صرف یہی نہیں بلکہ آتے جاتے' "راستے میں چولا چکنے دا" والا گیت بھی سناتا رہا۔ ایک دو من چلے دوستوں نے اونٹ گاڑی میں اس گیت پر رقص کرنے کی کوشش بھی کی' مگر اونٹ نے گردن گھما کر قہر آلود نگاہوں سے اس طرح دیکھا جیسے کہہ رہا ہو "گیت کا مزا خراب نہ کرو' یار!" ـــ تو وہ حضرات دم سادھ کر بیٹھ گئے۔

کہ درویشی بھی عیاشی ہے ۔۔۔

ہمارے ایک دوست کے پیر و مرشد عیسیٰ خیل تشریف لائے تو ان کے اعزاز میں ایک خصوصی تقریب منعقد ہوئی جس میں عطا نے ان کی خدمت میں اپنے فن کا نذرانہ پیش کیا۔ پیر صاحب تیس پینتیس برس کے خوبرو خوش طبع نوجوان تھے۔ تقریب کے آغاز میں تو ہم سب لوگ نہایت باادب اور باملاحظہ ہوشیار رہے، مگر عطا کی گلوکاری کے دوران پیر صاحب کی حرکات و سکنات دیکھ کر ادب اور ملاحظہ تو رخصت ہو گئے صرف ہوشیاری باقی رہ گئی۔ محفل کی ترتیب کچھ یوں تھی کہ ایک چھوٹے سے کمرے میں ایک جانب پیر صاحب ایک چارپائی پر گاؤ تکیہ لگائے تشریف فرما تھے۔ ان کے سامنے دری پر ہم سب لوگ ہاتھ باندھے بیٹھے تھے۔ ہاتھ باندھنے کی شرط سے عطا اور ملازم حسین آزاد تھے کیونکہ عطا گا رہا تھا اور ملازم حسین طبلے پر سنگت کر رہا تھا۔ شروع میں تو پیر صاحب کی تمام تر توجہ عطا اور اس کے فن پر رہی اور "واہ واہ" "کیا بات ہے" کہہ کر داد دیتے رہے، مگر پھر اچانک ان کی نگاہ جوہر شناس ایک حسین چہرے پر پڑی اور وہ ادھر ہی کے ہو کر رہ گئے۔ میرے ایک طرف وہ حسین چہرہ اور دوسری طرف اس کے والد محترم تشریف فرما تھا۔ پیر صاحب کی اس چہرے پر مسلسل عنایت دیکھ کر مجھے یہ ڈر تھا کہ اس کے والد بزرگوار پیر صاحب کی ضرورت سے زیادہ توجہ سے بدگمان ہو کر پیر صاحب کو ان کی خوبصورت گھنگھریالی زلفوں سے پکڑ کر وہیں فرش پر گھسیٹنا نہ شروع کر دیں۔ لہٰذا میں سرک کر اس طرح بیٹھ گیا کہ وہ چہرہ پیر صاحب کی نگاہوں سے اوجھل ہو گیا۔ پیر صاحب نے ایک قہر آلود نظر مجھ پر ڈالی، مگر شکر ہے کہ منہ سے کچھ بولے نہیں، ورنہ شرفاء کا یہ باوقار اجتماع کسی پنجابی فلم کا آخری سین بن جاتا۔

محفل ختم ہوئی اور بیشتر احباب رخصت ہو گئے تو پیر صاحب کے ساتھ ایک بے تکلف نشست ہوئی جس کے دوران انہوں نے اپنی سرگرمیوں کی تفصیل بتاتے ہوئے اپنا بریف کیس کھولا اور مختلف حسین چہروں کی درجنوں تصاویر نکال کر ہمارے سامنے رکھ دیں اور پھر آہ بھر کر عطا سے کہنے لگے "یار یہ تمہارے والا ہنر اگر میرے پاس ہوتا تو اپنے وارے نیارے ہو جاتے۔" (تصویریں تمام صرف مردانہ چہروں کی تھیں۔)

تقریباً ایک گھنٹہ تک پیر صاحب کی دلچسپ باتیں سننے کے بعد ہم ان سے رخصت ہوئے تو راستے میں ان کے سادہ لوح مریدوں کے مستقبل پر غور کرتے رہے۔ مگر افسوس کہ ہمارے غور کرنے کے باوجود ان بچاروں کا مستقبل تاریک ہی نظر آتا تھا۔ البتہ اس خیال سے کچھ اطمینان نصیب ہوا کہ مستقبل پیر صاحب کا بھی ان سے کچھ

مختلف نہ ہو گا۔

پیر صاحب دو تین دن عیسیٰ خیل میں مقیم رہے ۔ ان دو تین دنوں میں عطا تو باقاعدگی سے ان کی خدمت میں حاضری دیتا رہا۔ مگر ہمیں دوسری بار حاضر خدمت ہونے کی سعادت نصیب نہ ہو سکی ۔

گھر آئے مہمان

ایک دفعہ ہمارے کسی عقیدت مند نے ایک بھاری بھرکم مرغ ہماری نذر کیا تو ہم نے سوچا کہ احباب کو ممنون کرنے کا اس سے بہتر موقع پھر کہاں نصیب ہو گا۔ لہٰذا ہم نے عطا' شفا اور ماسٹر وزیر کو شام کے کھانے کی دعوت دے دی ۔

تقریباً عصر کے وقت یہ تینوں حضرات ہماری خدمت میں حاضر ہوئے اور کہا "لالا ہم ذرا کم مشانی تک جا رہے ہیں ۔ واپسی میں ایک آدھ گھنٹہ تاخیر ہو جائے تو فکر نہ کرنا"۔

ہم نے بخوشی انہیں جانے کی اجازت دے دی اور خود دعوت کی تیاریوں میں لگ گئے ۔

شام ہوئی ' رات ہوئی ۔۔۔ دس بجے تک انتظار کرنے کے بعد ہم معزز مہمانوں کی سات پشتوں کو جی بھر کر کوسنے کے بعد لمبی تان کر آرام سے سو گئے ۔

ٹھیک ڈیڑھ بجے دروازے پر دستک ہوئی ۔ ہم آنکھیں ملتے باہر نکلے تو تینوں مہمان مجرموں کی طرح سر جھکائے کھڑے معافیاں مانگ رہے تھے ۔

"معاف کر دو لالا ۔ ذرا دیر ہو گئی" عطا نے بڑی عاجزی سے کہا "مگر ہم اپنے قصور کی تلافی ابھی کئے دیتے ہیں ۔ وہ یوں کہ کھانا جیسا ہے جس حال میں ہے یہیں گلی میں لے آؤ ۔ ہم یہیں بیٹھ کر کھا لیتے ہیں ۔ اور خبردار اس وقت گھر والوں کو جگا کر کھانا گرم کرنے کی زحمت نہ دینا ۔ ڈرائنگ روم کھولنے کی بھی اجازت نہیں ' کیونکہ اس طرح شور ہو گا اور بچے جاگ اٹھیں گے تو کیا کہیں گے کہ کیسے لفنگے چاچوں سے واسطہ پڑا ہے ۔

ہم نے معزز مہمانوں کی دل شکنی کرنا گوارا نہ کیا اور ان کی فرمائش حرف بہ حرف پوری کر دی ۔ ٹھنڈا ایخ سالن ' گتے جیسی خشک روٹیاں اور منجمد حلوہ ان حضرات نے گلی کے فرش پر بیٹھ کر کھایا اور ہمیں دعائیں دیتے رخصت ہو گئے ۔

سیما بہن! ہم تم کو نہیں بھولے

عطا کی بہن سیما کی ناگہاں موت عطا کی زندگی کا سب سے بڑا سانحہ تھی۔ سیما عطا سے دو تین سال چھوٹی تھی۔ اپنی ذہانت' خوش مزاجی اور غم گساری کی وجہ سے اپنے کنبے کی آنکھوں کا تارا تھی ۔ خاص طور پر عطا کے والد محترم تو سیما کے مشورے کے بغیر گھریلو معاملات کے بارے میں کوئی بھی فیصلہ کرنا پسند نہیں کرتے تھے۔ اور ان کی یہی جذباتی کمزوری عطا سے ان کی ناراضگی کا کبھی سوال ہی پیدا نہ ہونے دیتی' کیونکہ سیما کی عطا سے بے پناہ محبت ہر نازک وقت میں ابو کے غیظ و غضب کو ایک بے بس تبسم میں بدل دیتی۔

"خبردار ابو! سیما بڑے مان سے کہتی" میرے بھائی کو کچھ ہو گیا تو عمر بھر آپ سے نہیں بولوں گی"

اور سیما کی یہ معصوم دھمکی ہمیشہ کارگر ثابت ہوتی۔ چہیتی بیٹی کا روٹھنا انہیں کسی قیمت پر گوارا نہ تھا۔ شاید ان کے دل کی گہرائیوں میں کسی جگہ یہ سچا خوف پنہاں تھا کہ سیما اگر ایک بار روٹھ گئی تو پھر کبھی لوٹ کر نہ آئے گی۔

ابو کا یہ خوف کتنا سچا تھا۔ سیما کی زندگی چراغ آخر شب کی لرزتی لو ثابت ہوئی۔

خوش درخشید ولے شعلہ مستعجل بود

موت کے بے رحم ہاتھوں نے یہ چراغ سحر سے بھی کچھ پہلے گل کر دیا۔ سیما بس چند روز گردے کے مرض میں مبتلا رہ کر اپنے تین ننھے منے بچوں کو بلکتا چھوڑ کر اس دار فانی سے رخصت ہو گئی۔ ننھا اصغر رزاق ماں کی جدائی کا صدمہ برداشت نہ کر سکا اور چند ہی روز بعد ہمیشہ کے لئے ماں کی آغوش میں جا سویا۔ اصغر کی لوح مزار کے لئے عطا نے کچھ لکھنے کو کہا تو آنکھوں سے اڈتے آنسو مجھ سے چھپانے کے لئے منہ پھیر لیا۔ مگر میری آنکھوں میں لرزتے ہوئے آنسو لفظوں میں ڈھل کر درج ذیل قطعہ کی صورت میں صفحہ قرطاس پر بکھر گئے۔

ایک اجڑے ہوئے گلشن کے گل نورستہ
تو نے کس خوف کے مارے یہ جہان چھوڑ دیا
آہ کیا تلخ حقیقت ہے ترا یوں جانا
کٹ گئی شاخ تو غنچے نے بھی دم توڑ دیا

سنگ مرمر کی ننھی سی تختی پر کندہ' یہ قطعہ اصغر کی ننھی سی قبر پر نصب ہے۔

بہن کی قیمتی جان بچانے کے لیے عطا نے کیا کچھ نہ کیا۔ سیما کی بیماری کے آخری دنوں میں ڈاکٹروں نے اس کی جان بچانے کے لئے خون کا عطیہ طلب کیا تو عطا نے اپنے

نحیف و نزار جسم سے ڈھیر سارا خون بھی دیا۔ اس موقع پر ڈسٹرکٹ ہیڈ کوارٹر ہسپتال میانوالی میں عطا کے چند عزیزوں کے ساتھ میں بھی موجود تھا۔ خون دینے کے بعد عطا کے جسم میں اتنی سکت بھی نہ رہی کہ اپنے پاؤں پر چل کر تانگے تک پہنچ سکتا۔ ہم لوگ اسے سہارا دے کر تانگے تک لائے اور وہ تانگے کی پچھلی نشست پر لیٹ کر بہ صد مشکل اپنی قیام گاہ تک پہنچا۔

ادھر چارہ گری کے یہ ترلے ہو رہے تھے' اور ادھر سیما کی رخصتی کا حکم جاری ہو چکا تھا۔ کسی کی کیا مجال جو موت کی ڈولی کو خالی واپس لوٹا دے۔ یا لمحہ بھر کو روک ہی لے' بھائی کی شہ رگ کے خون کی توانائی بھی بہن کو موت کی گرفت سے نہ چھین سکی اور اسی رات کی ایک مہلک ساعت سیما کو اپنے ہمراہ لے کر سرحد زیست کے اس پار ہمیشہ ہمیشہ کے لئے غائب ہو گئی۔

سیما کی موت کا زخم عطا کے سینے میں آج بھی ہرا ہے۔ اسی لئے وہ "لالا جاگ" والا گیت نہ گا سکتا ہے' نہ سن سکتا ہے۔

لالا جاگ والا گیت ہمارے علاقہ کا وہ لوک گیت ہے جو بہنیں اپنے بھائیوں کی شادی کے موقع پر رات کے پچھلے پہر گا کر انہیں نیند سے جگاتی ہیں اور ان کے ہاتھ پاؤں میں مہندی لگا کر انہیں دولہا بناتی ہیں۔ بہن کی پاکیزہ' محبت کا اظہار شعر کی صورت میں جس خلوص' پیار اور سادگی سے اس گیت میں کیا گیا ہے اس کی مثال کہیں اور ملنا ناممکن ہے

عطا کی پہلی شادی ہوئی تو یہ گیت گانے والی ٹولی کی قیادت سیما ہی نے کی اور اسی نے اپنے ہاتھوں سے عطا کے ہاتھ پاؤں میں مہندی لگائی۔

سیما کے شوہر عبدالرزاق خان ملازمت کے سلسلہ میں ایک عرصہ تک گجرات میں مقیم رہے۔ یوں شادی کے بعد سیما کی زندگی کا بیشتر حصہ گجرات میں بسر ہوا۔

عطا بہن سے ملنے اکثر گجرات جاتا اور ادھر ہی کا ہو کر رہ جاتا۔ واپسی کے لئے والدین کا اصرار جب ناراضگی کی حدوں کو چھونے لگتا تو بادل ناخواستہ واپس آجاتا' مگر چند ہی روز بعد کسی نہ کسی بہانے پھر گجرات پہنچ جاتا۔

گجرات میں قیام کے دوران عطا حسب معمول ہر رات دیر تک نغمہ سرائی کا شغل بھی جاری رکھتا۔ اس دور میں اس کے گائے ہوئے گیت متعدد کیسٹوں میں محفوظ ہیں۔

سیما کے شوہر بچپن میں میرے ہم درس رہے' سیما کی وفات سے کچھ عرصہ بعد

ایک دن وہ مجھے اپنے گھر لے گئے اور گجرات میں اپنے قیام کے دوران عطا کے ریکارڈ کئے ہوئے کیسٹ سنوانے لگے۔ ہم ایک کیسٹ سن رہے تھے کہ اس میں سے دروازہ کھلنے کی آواز اور پھر پیالیوں کی کھنک سنائی دی۔ رزاق خان کی آنکھوں سے بے اختیار آنسو بہہ نکلے۔ کیسٹ فوراً بند کرتے ہوئے آہ بھر کر کہنے لگے۔

"یہ آواز سنی تم نے۔ سیما ہمارے لئے چائے بنا کر لائی ہے"۔

اللہ اللہ! سیما اپنے پیچھے کیسی زندہ یادیں چھوڑ گئی۔ وہ یقیناً ان لوگوں میں سے تھی جو مر کر بھی فنا نہیں ہوتے اور کسی نہ کسی روپ میں مسلسل اپنے وجود کا احساس دلاتے رہتے ہیں۔ چاہے وہ روپ پیالیوں کی کھنک ہو یا دروازہ کھلنے کی آواز۔ لتا منگیشکر کا یہ گیت شاید ایسے ہی لوگوں کے بارے میں ہے۔

رہیں نہ رہیں ہم
مہکا کریں گے
بن کے کلی
بن کے کرن
باد صبا میں

سیما کے آنچل کا سایہ سرے سے ہٹا تو عطا کو پہلی بار آلام کی اس اذیت ناک تپش کا احساس ہوا' جو ایک عرصہ سے اسی دن کی منتظر تھی۔ اتنے بڑے سانحے کے بعد عطا کا محض زندہ رہنا ہی ایک معجزے سے کم نہ تھا۔ اس کی شخصیت کی ہری بھری شاخ پر یہ سانحہ بجلی بن کر گرا۔ عطا کی حالت پاگلوں جیسی ہو گئی۔ اسے دیکھ کر طرح طرح کے ہولناک وسوسوں سے دل لرز لرز جاتے۔

"یہ شخص اس حال میں کب تک جی لے گا؟" یہ سوال کسی کے لب پر تو نہ آسکا' مگر ایک ہولناک پرچھائیں کی طرح عطا کے اردگرد ہر وقت منڈلاتا دکھائی دیتا۔ وہ دن بدن زندگی سے دور ہوتا جا رہا تھا۔ مایوسی کے تاریک سائے اسے چاروں طرف سے گھیر کر ایک بھیانک منزل کی طرف لے جا رہے تھے۔ ان سایوں کا حصار اتنا مضبوط تھا کہ تسلی اور نصیحت کا کوئی لفظ بھی عطا تک پہنچانا ناممکن تھا۔۔۔ ادھر ہم لوگوں کے خوف و ہراس کا یہ عالم' اور ادھر دور' بہت دور' آسمانوں کی بلندیوں پر یہ فیصلہ ہو چکا تھا کہ غروب کی ان علامات میں سے طلوع کا معجزہ دکھایا جائے گا۔

ڈھلتے سورج کا طلوع

یاس و حرماں کے اس دور میں عطا کو تونسہ شریف کے سالانہ عرس میں شرکت کی دعوت موصول ہوئی اور ہم سب لوگوں نے مل کر بہ صد مشکل اسے وہاں جانے پر رضامند کر لیا۔ ہمارا اندازہ یہ تھا کہ چند روز گھر سے دور رہ کر اس کی حالت کچھ سنبھل جائے گی مگر یہ اندازہ غلط نکلا۔ وہ تونسہ سے واپس آیا تو اس کی آنکھوں میں یاس کے سائے کچھ اور گھرے دکھائی دیتے۔

اسی دن دوپہر کو ایک صاحب کار میں فیصل آباد سے عیسیٰ خیل وارد ہوئے۔ عطا کا اتا پتہ پوچھتے ہوئے الصدف جنرل سٹور پر پہنچے۔ وہاں سے معلوم ہوا کہ عطا اس وقت گھر پر موجود ہو گا۔ عطا کے ایک عزیز کے ہمراہ وہاں آئے۔ عطا اس وقت میکدے میں سویا ہوا تھا۔ اسے جگا کر ان صاحب نے اپنا تعارف کراتے ہوئے بتایا کہ وہ فیصل آباد میں امین پور بازار میں رحمت گراموفون کمپنی نامی ادارے کے مالک ہیں اور عطا کی آواز میں چند کیسٹ ریکارڈ کرنا چاہتے ہیں۔ عطا نے ان کی مناسب خاطر مدارات کرنے کے بعد چند روز تک فیصل آباد پہنچنے کا فیصلہ کر کے انہیں رخصت کر دیا۔ مگر ہم لوگوں کے تمام تر اصرار کے باوجود وہ یہ وعدہ پورا کرنے کے لئے خود کو آمادہ نہ کر سکا۔

چند روز بعد رحمت صاحب عطا کو اپنا وعدہ یاد دلانے کے لئے ایک بار پھر عیسیٰ خیل پہنچے۔ عطا نے انہیں ایک اور وعدے سے مطمئن کر کے رخصت کر دیا مگر یہ وعدہ بھی پورا نہ ہوا اور رحمت صاحب کو ایک بار پھر عیسیٰ خیل آنا پڑا۔ مگر اب کی بار وہ وعدہ لے کر جانے کیلئے نہیں بلکہ عطا کو ہمراہ لے کر جانے کا مصمم ارادہ کر کے آئے تھے۔ کچھ ان کا اصرار، کچھ احباب کی ضد۔ عطا کو ان کے ہمراہ جانا ہی پڑا۔

عیسیٰ خیل سے فیصل آباد تک کا یہی سفر عطا کے لئے عالمگیر تعارف اور مقبولیت کا سبب بن گیا۔ چند ہی روز بعد عطا کے پہلے چار کمرشل کیسٹ منظر عام پر آئے تو خیبر سے کراچی تک تہلکہ مچ گیا۔ بڑے بڑے نامور اور مقبول گلوکاروں کی آوازیں آخر شب کے ستاروں کی طرح آناً فاناً پس منظر کے دھندلکوں میں غائب ہو گئیں۔ گھروں، گلیوں، ہوٹلوں اور گاڑیوں میں ہر جگہ عطا ہی کی آواز گونجنے لگی۔

اسی ایک آواز کی خاطر لوگوں نے ٹیپ ریکارڈ پلیئر خریدے۔ کیسٹوں کا کاروبار چمک اٹھا۔ جگہ جگہ کیسٹوں کی دکانیں کھل گئیں۔ عطا کے کیسٹوں کی مانگ اس قدر بڑھ گئی کہ ریکارڈنگ کمپنی دن رات کام کرنے کے باوجود مطلوبہ تعداد میں کیسٹ فراہم نہ کر سکی۔ اس کمی کو پورا کرنے کے لئے کیسٹوں کا کاروبار کرنے والے لوگوں نے

اپنے ڈبلی کیشو خرید لئے اور یوں ایک ایک کیسٹ کی ہزاروں کاپیاں تیار ہو کر مارکیٹ میں آ گئیں۔ ہزاروں لوگوں نے لاکھوں روپے کمائے۔ ای ایم آئی' شالیمار ریکارڈنگ کمپنی' پی ایم سی اور سونک جیسے بڑے اداروں نے عطا سے براہ راست رابطہ قائم کر کے دھڑا دھڑ اس کے کیسٹ ریکارڈ کرنے شروع کئے۔ پہلے چار کیسٹ مارکیٹ میں آنے کے ایک ہی ماہ بعد عطا نے لمبی چوڑی خوبصورت مزدا ۹۲۹ گاڑی خرید لی۔ اور اسلام آباد میں ایک خوبصورت مکان کرائے پر لے کر وہاں منتقل ہو گیا۔ کیسٹوں کی آمدنی میں سے اگرچہ عطا کو اس کا پورا پورا حق کبھی نہ مل سکا' تاہم مختلف تقریبات اور موسیقی کی خصوصی محفلوں سے ہونے والی آمدنی نے عطا کا معیار زندگی خاصا بلند کر دیا۔ اگر وہ انکم ٹیکس کی چوری کا ہنر بھی سیکھ لیتا تو آج کروڑ پتی کہلاتا۔

عطا کی آواز کی روز افزوں مقبولیت نے ریڈیو اور ٹیلی ویژن کے کارپردازوں کو بھی اس کی اہمیت کا احساس بہت جلد دلا دیا اور ادھر سے بھی پے در پے بلاوے آنے لگے۔ عطا جب پہلی بار ریڈیو کے لئے ریکارڈنگ کرانے گیا تو ریڈیو سٹیشن کے ڈائریکٹر صاحب نے اپنے کمرے سے باہر آ کر عطا کا استقبال کیا۔ آڈیشن Audition کے تکلفات میں پڑے بغیر عطا کو گریڈ اے کا گلوکار قرار دیا گیا۔ ٹیلی ویژن کے ایک پروڈیوسر کا کہنا ہے کہ ٹیلی ویژن کی دنیا میں عطا کو وی آئی پی (اہم ترین شخصیت) شمار کیا جاتا ہے۔

نامور اداکار خیام سرحدی نے رم جھم کے عنوان سے راولپنڈی' کراچی' لاہور' فیصل آباد اور سرگودھا میں عطا کے کئی شو منعقد کئے۔ مختلف مقامات پر فائیو اسٹار ہوٹلوں میں عطا کے کئی شو "درد کا سفیر" کے عنوان سے ریکارڈ ہوئے۔

ایکسائز والوں کی مہربانی سے رم جھم والا سلسلہ کاروباری اعتبار سے زیادہ منافع بخش ثابت نہ ہو سکا۔ عطا کا کہنا ہے کہ ایک دفعہ کراچی کے ایک بڑے ہوٹل میں اس کا ایک خصوصی شو منعقد ہوا۔ ٹکٹوں کی فروخت کے حساب سے ہزاروں روپے کی آمدنی ہوئی۔ مگر ایکسائز ڈیوٹی' سازندوں کا معاوضہ اور ہوٹل کا بل ادا کر کے جب وہ ہوٹل سے نکلا تو جیب میں صرف کار کی چابی تھی۔

بیرون ملک مقیم پاکستانیوں کی معرفت عطا کی آواز دنیا کے ہر کونے میں پہنچ گئی۔ اور اسے قریب سے دیکھنے کا اشتیاق اس قدر بڑھ گیا کہ ڈنمارک اور ناروے جیسے دور دراز ممالک سے بھی بلاوے آنے لگے۔ اس طرح عطا کو متعدد ممالک میں اپنے فن کا مظاہرہ کرنے کے مواقع نصیب ہوئے۔

آج' تقریباً گیارہ سال بعد بھی عطا کی مقبولیت کا وہی عالم ہے جو پہلے تھا۔

عطا نے لاہور میں مقیم ہونے کا فیصلہ کیا تو اس کے اکثر احباب کو یہ خدشہ لاحق ہو گیا کہ لاہور میں سکونت کہیں اس کے لئے نقصان دہ ثابت نہ ہو۔ ان کی دلیل یہ تھی کہ لاہور میں سرکردہ فنکاروں کی جو اجارہ داری قائم ہے عطا کے ہاتھوں اسے خطرے میں دیکھ کر اس کے خلاف محاذ آرائی برپا ہو سکتی ہے۔ مگر عطا کی عالمگیر محبت اور انکسار نے ایسی صورت پیدا ہی نہیں ہونے دی۔ کہتے ہیں کہ شیخ زکریاؒ جب ملتان میں وارد ہوئے اور وہاں مستقل سکونت کا ارادہ ظاہر کیا تو اس زمانے کے برگزیدہ بزرگوں میں کسی نے دودھ سے لبالب بھرا ہوا پیالہ ان کی خدمت میں بھجوایا۔ شیخ زکریاؒ نے گلاب کا ایک پھول لبالب بھرے ہوئے پیالے میں ڈال کر پیالہ جوں کا توں واپس بھیج دیا۔ خام جب وہ پیالہ لے کر ان بزرگ کی خدمت میں واپس پہنچا تو وہ دودھ کے اوپر گلاب کا پھول تیرتا دیکھ عش عش کر اٹھے۔ فرمایا کیا خوبصورت جواب دیا ہے زکریاؒ نے۔

خادم کے دریافت کرنے پر انہوں نے فرمایا "میں نے زکریاؒ کو دودھ سے لبالب بھرا ہوا پیالہ یہ سمجھانے کے لئے بھیجا تھا کہ ملتان کا شہر اولیاء سے لبالب بھرا ہوا ہے۔ لہٰذا یہاں کسی اور کے رہنے کی گنجائش نہیں۔۔۔ زکریاؒ نے دودھ میں پھول ڈال کر یہ جواب دیا ہے کہ میں اس پھول کی طرح اپنے لئے گنجائش خود پیدا کر لوں گا اور اس طرح رہوں گا کہ میرے وجود سے کسی کو تکلیف بھی نہ پہنچے گی۔

کچھ اسی انداز میں عطا بھی اہل فن سے لبالب بھرے ہوئے شہر لاہور میں مقیم ہے۔ وہ سب سے پیار کرتا ہے اور سب اس سے پیار کرتے ہیں۔

آشیاں کتنے بنائے......

عطا کی شادیوں کے اعداد و شمار جمع کرنے کے شوقین حضرات مطلع ہوں کہ عطا نے اب تک صرف چار شادیاں کی ہیں، اور کم از کم ۹۰ سال کی عمر تک پانچویں شادی کرنے کا کوئی امکان نظر نہیں آتا۔۔۔۔ پہلی تین شادیوں کی ناکامی کے اسباب و وجوہات کی فکر میں دماغ سوزی کرنے والے احباب کی تسلی کیلئے میرا یہ شعر کافی ہو گا کہ

کوئی کہے تھی خطا تمہاری، کوئی کہے تھی میری خطا
اپنا گھر جلنے کا حاصل، صرف یہی افسانے ہیں

اور اب یہ افسانے بھی ختم ہو جانے چاہیں، کیونکہ ان سے طرفین کی دل آزاری کے سوا کچھ حاصل نہیں ہو گا۔

پہلی شادی

عطا کی پہلی شادی اپنے خاندان میں ہوئی۔ اس شادی کی تقریب ہر لحاظ سے ایک یاد گار تقریب تھی۔ اس لحاظ سے بھی کہ اس میں عطا کے تمام احباب کو اپنے اپنے فن کا مظاہرہ کرنے کا موقع ملا۔ کسی نے میزبانی کی اعلیٰ صلاحیتوں کا مظاہرہ کیا' تو کسی نے بجلی کے رنگا رنگ قمقموں سے آرائش کا کمال دکھایا جس سے کچھ اور نہ ہو سکا اس نے ڈھول کی تھاپ پر رقص کر کے حق دوستی ادا کیا۔

سہرا لکھنے کی سعادت چچا جان کے حکم پر میرے حصے میں آئی۔ کاش اس وقت وہ پوری نظم میری دسترس میں ہوتی۔ عقیل عیسیٰ خیلوی کی خوبصورت کتابت میں یہ نظم ایک قد آدم فریم میں سجا کر میکدے کے ساتھ والے کمرے آویزاں کی گئی تھی۔ شاید اب بھی وہاں لگی ہو۔ بہر حال اب وہاں تک رسائی کیلئے بھی خاصا تردد درکار ہو گا للذا فی الحال ایک ہی شعر پر اکتفا کیجئے۔ یہ شعر میں نے عطا کے ایک تازہ معاشقے کے حوالے سے لکھا تھا' جو اس بروقت شادی کے باعث پایہ تکمیل کو نہ پہنچ سکا۔ شعر تھا

سمیٹتا ہے گریباں کی دھجیاں کوئی
نظر جو پڑتی ہے اس تار تار سہرے پر

روایتی انداز میں سہرا سازو آواز سے مزین کر کے عطا کی نذر کرنے کیلئے احباب کے اتفاق رائے سے نامور ریڈیو سنگر استاد امتیاز خالق عیسیٰ خیلوی کی خدمات حاصل کی گئیں۔ دلہن کی طرح سجے ہوئے پنڈال میں رنگا رنگ روشنیوں سے آراستہ سٹیج پر بیٹھ کر استاد امتیاز خالق نے یہ سہرا اپنی خوبصورت آواز میں گایا تو محفل جھوم اٹھی۔ عطا نے احباب کی معرفت فرمائشیں بھیج کر اوپر دیا ہوا شعر بار بار پڑھوایا۔

عطا کے ایک من چلے دوست نے لاہور سے دو مغنیات بھی درآمد کر لی تھیں۔ اس محفل میں انہوں نے بھی اپنے فن کا جادو جگا کر بھرپور داد پائی۔

رات بھیگ چلی تو احباب نے پکڑ جکڑ کر عطا کو بھی سٹیج پر لا بٹھایا۔ یہ الگ بات کہ اس رات کی نغمہ سرائی اسے خاصی مہنگی پڑی۔ وہ یوں کہ ایک مغنیہ اس کی آواز کے سحر میں گرفتار ہو گئی۔ یوں اس رات عطا کی زندگی میں بیک وقت دو کہانیوں نے جنم لیا۔ ایک کہانی اس کی شادی کی' دوسری اس تازہ ترین معاشقے کی۔

عطا کا دل اس زمانے میں بڑا بے حیا ہوا کرتا تھا۔ اتنا بے حیا کہ شادی کے چوتھے ہی دن عطا اس مغنیہ کے تعاقب میں لاہور روانہ ہو گیا۔ شکر ہے وہ ہاتھ سے نکل گئی اور یہ حضرت

ایک دو دن گلیوں کی خاک چھاننے کے بعد بخیر و عافیت واپس آ گئے۔

شادی کے بعد دو تین سال کا عرصہ تو سکون سے بسر ہوا، مگر پھر خاندانی رنجشوں کی آندھیاں آٹھیں اور اس آشیاں کا تنکا تک شاخ پہ باقی نہ رہا۔

دوسری شادی

عطا کی دوسری شادی کے بارے میں معلومات نہ ہونے کے برابر ہیں۔ بس اتنا معلوم ہوا کہ عطا بعض احباب کی دعوت پر کراچی گیا۔ وہاں سے واپس آیا تو ایک خاتون ہمراہ تھیں۔ چند ہی روز بعد معلوم ہوا کہ وہ خاتون اپنے بعض عزیزوں کے ہمراہ کراچی واپس چلی گئیں۔ وجہ یہ تھی کراچی کے ہوادار ماحول میں پرورش پانے والی لڑکی کو عیسیٰ خیل کا محبوس گھریلو ماحول راس نہ آسکا۔

باہر کی خواتین کیلئے عیسیٰ خیل کے ماحول میں رہنا واقعی خاصا مشکل ہے۔ عیسیٰ خیل میں اپنے پانچ سال قیام کے دوران میں نے ایک آدھ مرتبہ سے زیادہ کسی خاتون کو گھر سے نکلتے نہیں دیکھا۔ فلک بوس حویلیوں سے خواتین کے جنازے تو نکلتے دیکھے، کسی زندہ خاتون کو باہر نکلتے نہیں دیکھا۔

پردہ کے بارے میں عیسیٰ خیل کی روایات بہت سخت ہیں۔ شادی بیاہ کے موقع پر بھی آپ کو خواتین کے لمبے لمبے جلوس ڈولی کے ہمراہ نظر نہیں آئیں گے۔ بلکہ ڈولی بھی نظر نہیں آئے گی کیونکہ پردہ داری کی خاطر ڈولیاں ہمیشہ رات کے وقت اٹھائی جاتی ہیں۔ اور ڈولی اٹھانے کیلئے کوئی بارات وارات نہیں جاتی۔ بس دولہا کے چند قریبی رشتہ دار جا کر ڈولی اٹھا لاتے ہیں۔

تیسری شادی

۱۹۸۳ء میں عطا انگلینڈ کے دورے سے واپس آیا تو اور چیزوں کے علاوہ ایک دلہن بھی ساتھ لایا۔ عام طور پر پاکستانی بھائی ولایت سے ولایتی دلہن لاتے ہیں۔ مگر عطا کی یہ دلہن نہ صرف پاکستانی تھی بلکہ اس کے اپنے ضلع میانوالی اور اس کے اپنے قبیلہ نیازی کی ایک سادہ سی لڑکی تھی۔ یہ شادی بظاہر خاصی کامیاب شادی تھی۔ مگر کچھ عرصہ بعد سنا کہ میاں بیوی میں علیحدگی ہو گئی۔ اور پھر کچھ عرصہ بعد سنا کہ علیحدگی مستقل ہو گئی ہے۔ لوگ کچھ

بھی کہیں ' پے در پے تین شادیوں کے حسرت ناک انجام نے عطا کے جذبات اور اعصاب کو بری طرح مجروح کیا۔ گھر کا اجڑنا اتنا معمولی سانحہ ہرگز نہیں ہوتا کہ انسان اسے ہنسی خوشی برداشت کر کے بھلا دے۔ اس قسم کے سانحہ کے بعد نارمل ہونے میں ایک عرصہ لگتا ہے۔

چوتھی شادی

عطا کی چوتھی بیگم (بھابھی بازغہ) فن کے راستے اس کی زندگی میں داخل ہوئیں۔ لاکھوں لوگوں کی طرح یہ بھی عطا کے فن پر فریفتہ ہوئیں۔ مگر ان کا عشق ذرا وکھری ٹائپ کا تھا۔ عطا نے ایک دفعہ بتایا کہ اس کے ایک کمرشل فنکشن میں انہیں ہال میں جگہ نہ مل سکی تو سیڑھیوں پر کھڑے کھڑے تقریب کے چار پانچ گھنٹے گزار دیئے۔ مگر تھک ہار کر لوٹ جانا گوارا نہ کیا۔ عطا سے تعارف غالباً اسی موقع پر تقریب کے بعد ہوا۔ اور عطا ان کے خلوص سے اس قدر متاثر ہوا کہ بہت جلد یہ تعارف افہام و تفہیم کے مراحل سے گذر کر شادی کی صورت میں زندگی بھر کا ساتھ بن گیا۔

عطا کی اس شادی کی کامیابی کی اصل وجہ یہ ہے کہ مشرقی روایات کے مطابق بازغہ نے عاشق کا رول اپنے لئے منتخب کیا اور محبوب کا درجہ عطا کو دیا۔ اس کی ہر ادا سے پیار کر کے اس کی تمام تر محرومیون کی تلافی کرنا اپنا فرض سمجھا۔ اللہ تعالیٰ نے بہت جلد انہیں اولاد کی نعمت سے بھی نواز دیا اور یوں عطا اپنے ماضی کی تمام تر تلخیوں اور محرومیوں کو بھلا کر اپنی وفا شعار بیوی اور دو ننھے منے بچوں سانول اور لاریب کے ساتھ مسرت اور اطمینان کی زندگی بسر کر رہا ہے۔ اور یار لوگ خوش ہیں کہ

عمر بھر کی بے قراری کو قرار آ ہی گیا

اور عطا کی بیگم اس بات پر خوش ہیں کہ۔۔۔

وہ جہاں بھی گیا لوٹا تو مرے پاس آیا
بس یہی بات ہے اچھی مرے ہرجائی کی

وہ کیا چکر تھا؟

عطا سے دوستی کا ایک فائدہ یا نقصان یہ ہے کہ ہمارا تعارف جہاں بھی ہو عطا سے دوستی کا حوالہ اس عالم فانی میں ہمارے وجود کے جواز کے طور پر ضرور پیش کیا جاتا ہے۔

”جی یہ منور علی ملک صاحب ہیں۔ عطا اللہ خان عیسیٰ خیلوی کے بہت قریبی دوست ہیں۔ عطا اللہ عیسیٰ خیلوی نے ان کے لکھے ہوئے بہت گیت گائے ہیں۔ مثلاً وہ گیت ہے نا۔

سچی دس وے ڈھولا کل کیوں نئیں آیا

”اچھا؟ پھر تو یہ بڑے کام کے آدمی ہیں۔ انہیں تو سب کچھ پتہ ہو گا۔ کیوں ملک صاحب، وہ کیا چکر تھا“

چکر سے مراد عطا کا وہ پہلا پیار ہے جس نے عیسیٰ خیل کے دور افتادہ قصبے کے نوجوان عطاء اللہ خان نیازی کو مشہور زمانہ گلوکار عطاء اللہ خان عیسیٰ خیلوی بنا دیا۔

عطا کے اس عشق کے بارے میں تجسس عرب اسرائیل جنگ، مسئلہ افغانستان اور تخفیف اسلحہ جیسے نازک مسائل کے بارے میں تشویش سے کسی طرح بھی کم نہیں۔

”ہاں تو وہ کیا چکر تھا یار؟“ یہی سوال لفظ بہ لفظ سنتے سنتے اب تو ہم عاجز آ گئے ہیں۔ کاش ہم اس سوال کا صحیح جواب بتا سکتے، مگر........

اس ناگزیر سوال کا جواب نہ دے سکنے کی بے بسی میں جھنجلا کر ہم بعض اوقات تو سوال کرنے والے پر برس پڑتے ہیں۔

”ہاں تو وہ کیا چکر تھا یار؟“ ہمارے ایک پروفیسر دوست نے کہا۔

”کون سا چکر؟“ ہم نے چمک کر پوچھا۔

”وہی یار عطا اللہ خان عیسیٰ خیلوی والا۔ سنا ہے اس نے کوئی عشق وشق کیا تھا؟“

”کیا ہو گا۔ ہمیں اس سے کیا؟“

”سنا ہے اسی عشق نے اس کو عطاء اللہ خان عیسیٰ خیلوی بنا دیا۔“

”آپ نے کبھی عشق نہیں کیا؟“

”ہاں۔ کیا تو تھا......“

”تو پھر آپ عطاء اللہ خان عیسیٰ خیلوی کیوں نہیں بن سکے؟“

یہ تسلی بخش جواب سن کر بھی وہ صاحب مطمئن تو نہیں ہوئے مگر ہمارا موڈ دیکھ کر خاموش ہی رہنا مناسب سمجھا۔

جن احباب سے ہمارا تعارف ہو چکا ہے انہیں تو ہم نے کوئی نہ کوئی الٹا سیدھا جواب یقیناً دے دیا ہو گا۔ اب آئندہ جن خواتین و حضرات سے تعارف ہو گا ان کی اطلاع کیلئے عرض ہے کہ صاحب

آپ وہ بات کیوں پوچھتے ہیں

جو بتانے کے قابل نہیں ہے

"اور وہ بات بتانے کے قابل اس لئے نہیں کہ اس کے منظر عام پر آنے سے کسی کا ہنستا بستا گھر ایک لمحہ میں اجڑ جائے گا۔ اس لئے اس راز کا انکشاف مجھے یا عطا کو کسی قیمت پر بھی گوارا نہیں ہو گا۔

ایک انسان کئی افسانے

"عطا کے عشق کی داستان تو ایک فقرے میں سمٹ گئی۔ مگر اس کے معاشقوں کی تفصیل ایک کتاب تو کیا' کئی جلدوں میں بھی بمشکل سمائے گی۔

"مختصراً یوں سمجھ لیجئے کہ عطا جہاں بھی گیا ایک آدھ فالتو دل جیب میں ڈال کر ہمراہ لے گیا۔ اور حسب ضرورت کسی نہ کسی کو دے کر ہی لوٹا۔ ہمارے علم کے مطابق اس کا ایک دل ملتان میں کسی کے پاس ہے۔ ایک گوجرانوالہ میں کسی کی سنگھار میز کی دراز میں رکھا ہے۔ ایک پنڈی میں کسی کے بیوٹی بکس میں محفوظ ہے۔ ایک اسلام آباد میں کسی کے پرس میں قید ہے۔ لاہور میں تو بے شمار گھروں میں ڈیکوریشن پیس کے طور پر ٹکراموں وغیرہ میں دیکھنے میں آتا ہے۔ دیہات میں البتہ نہ سنگھار میزیں ہوتی ہیں نہ بیوٹی بکس' نہ پرس' نہ ٹکرامے' لہٰذا وہاں یہ پلو میں بندھا یا تکیے کے غلاف میں ملفوف ملے گا

عذرا خان

نام اس کا جو بھی ہو' لوگ اسے عذرا خان کے نام سے جانتے تھے۔ وہ سانولی سی خوش چہرہ لڑکی نہ جانے کہاں سے آئی تھی۔ کچھ عرصہ ہمارے گاؤں میں سبزی وغیرہ کا کاروبار کرتی رہی' ایک شادی بھی ہوئی۔ دو بچے بھی ہوئے۔ پھر خاوند نے طلاق دے دی۔ کچھ عرصہ داؤد خیل ہی میں رہی' پھر پتہ نہیں کس کے مشورے پر عیسیٰ خیل آ گئی اور بس سٹینڈ پر سبزی کی دکان بنالی۔ بڑی دلیر لڑکی تھی۔ کیا مجال جو کوئی مرد آنکھ اٹھا کر بھی دیکھ سکے۔ ذرا سی ایسی ویسی حرکت پر اچھے خاصے مردوں کو روئی کی طرح دھن کے رکھ دیتی تھی۔۔ سچ پوچھیے تو لوفر لفنگے قسم کے مرد اس کی دکان کے سامنے سے بھیڑوں کی طرح سر جھکا کے گذر جاتے تھے۔

"عیسیٰ خیل میں عذرا کی آمد کا مجھے علم نہ تھا۔ ایک دن الصدف جنرل سٹور سے میں

اور عطا سہ پہر کو سیر کیلئے نکلے ۔ راستے میں عطا کے ایک دوست کی فروٹ کی دکان تھی ۔ علیک سلیک کے لئے وہاں رکے تو وہ صاحب سیب وغیرہ کاٹنے کے تکلفات میں پڑ گئے اور ہمیں کچھ دیر وہاں رکنا پڑ گیا۔ ہم وہاں بیٹھے سیب کھا رہے تھے کہ اچانک برابر والی دکان سے عذرا نمودار ہوئی ہمارے گاؤں میں طویل عرصہ تک قیام کی وجہ سے وہ ہمارے لئے اجنبی نہ تھی ۔ پھر بھی اس سے مخاطب ہونے کی جرات ہم سے نہ ہو سکی ۔ مگر ہماری یہ بزدلی بھی ہمارے کام نہ آئی ۔ وہ سیدھی ہماری طرف آئی اور خیر خیریت دریافت کرنے کے بعد عیسیٰ خیل میں اپنی آمد کے اسباب' واقعات اور نتائج کی تفصیل بیان کرنے لگی ۔ عطا اور اس کا دوست ہماری اس شناسائی پر حیران و پریشان آنکھوں ہی آنکھوں میں ایک دوسرے سے کہہ رہے تھے ۔

ہم تو مرشد تھے یہ ولی نکلے

ان کی حیرت' پریشانی اور سراسیمگی کو بھانپ کر عذرا نے انہی کی زبان (آنکھوں ہی آنکھوں میں) میں ہم سے پوچھا کہ یہ شرفاء کون لوگ ہیں ؟

دوسرے دوست کا تعارف کرانے کے بعد میں نے عطا کی طرف اشارہ کر کے کہا:

"اور یہ ہیں عطاء اللہ خان عیسیٰ خیلوی ۔"

"وہ جو گاتا ہے ؟"

"جی ہاں ۔"

"مذاق نہ کرو ۔"

"سچ کہہ رہا ہوں ۔ اس میں مذاق کی کون سی بات ہے ؟"

"چلئے مان لیا ۔ مگر یہ کیسا عطاء اللہ ہے ؟ ہم تو سمجھتے تھے وہ کوئی بڑی عمر کا آدمی ہو گا ۔"

"آدمی تو یہ بھی ہے' مگر اپنی عمر بڑھانا اس بیچارے کے اختیار میں نہیں ۔"

اس بات پر عطا سمیت سب نے قہقہہ لگایا ۔۔۔ اور پھر وہ براہ راست عطا سے مخاطب ہوئی ۔۔۔ بس یہی تعارف بقول ساحر لدھیانوی روگ بن گیا ۔ فراز صاحب کی طرح عطا نے بھی جس کو چاہا ہے اتنی شدت سے چاہا ہے کہ اپنی ہڈی پسلی کا بھی خیال نہیں کیا ۔

ایک نتیجہ اس نئی چاہت کا یہ نکلا کہ عطا اکثر میکدے سے غائب رہنے لگا ۔ ہم لوگ حسب معمول اپنے مقررہ وقت پر میکدے میں جمع ہوتے ۔ عطا کی غیر حاضری پر بحث کرتے اسے راہ راست پر لانے کے منصوبے بناتے' مگر ان منصوبوں پر عمل درآمد کبھی نہ ہو سکا' کیونکہ بعض احباب ایسے بھی تھے جو عطا کے ذاتی معاملات میں دخل دینے کے سخت

مخالف تھے' لہٰذا ہر رات کی بحث آپس میں تو تکار اور تلخ کلامی پر ختم ہوتی۔
الصدف جنرل سٹور میں بھی عطاء شاذو نادر ہی دیکھنے میں آتا۔ البتہ بس سٹینڈ پر سبزی اور فروٹ کی دکانوں کے گردو نواح میں کہیں نہ کہیں۔۔۔ الحفیظ ہوٹل کی کسی میز پر یا لالا کریم خان کے ہوٹل کی کسی چارپائی پر۔۔۔ بیٹھا' ضرور مل جاتا' مگر جذب و مستی کی ایسی کیفیت میں ہوتا کہ اسے دیکھ کر بے اختیار' اس پر ترس آجاتا اور ہم لوگ اس کے ساتھ چائے کی ایک آدھ پیالی پی کر نصیحتوں کی پٹاری بغل میں دابے چپ چاپ واپس آجاتے"
اور پھر ایک صبح اتفاقاً چچا جان نے اچانک میکدے کا دروازہ کھول کر دیکھا تو عطا اور عذرا بیٹھے ناشتہ کر رہے تھے۔ چچا جان نے تڑاخ سے دروازہ بند کیا اور گھر چلے گئے۔ اگلی صبح پتہ چلا کہ عطا گھر سے غائب ہے۔ حیرت کی بات تو یہ ہے کہ اس کے غائب ہونے کا عذرا کو بھی علم نہ ہوا۔ اور وہ بچاری کئی دن تک ہر آتے جاتے سے اس کا پتہ پوچھتی اور کوئی واضح جواب نہ پا کر اس آس پر قناعت کر لیتی کہ اس کی محبت عطا کو کہیں بھی چین سے نہ بیٹھنے دے گی۔ اور ایک نہ ایک دن وہ دل کے ہاتھوں مجبور ہو کر ضرور واپس آجائے گا۔
تقریباً ایک ماہ بعد کراچی سے ایک دوست خبر لائے کہ عطا ان دنوں وہاں اپنے بعض احباب کے ہاں مقیم ہے۔ ان صاحب سے عطا کا پتہ لے کر ہم نے ایک لمبا چوڑا نصیحت آموز خط فی الفور عطا کے نام روانہ کیا۔ توقع تھی کہ اس خط کے جواب میں

کچے دھاگے سے چلے آئیں گے سرکار بندھے

مگر جواب میں چند روز بعد ایک مختصر سا خط ملا۔ جس میں نہایت عاجزی سے یہ التجا کی گئی تھی کہ لالا مجھے میرے حال پر چھوڑ دو۔ اور میری واپسی کا خیال بھی دل سے نکال دو کہ

وحشی کو سکوں سے کیا مطلب جوگی کا نگر میں ٹھکانا کیا

اور ہاں' عذرا کہاں ہے اور کس حال میں ہے۔ اسے کہنا کہ۔۔۔

مری یاد میں تم نہ آنسو بہانا
نہ جی کو جلانا' مجھے بھول جانا

عطا کا یہ حوصلہ شکن جواب پڑھ کر بھی ہم مایوس نہ ہوئے اور اگلے ہی دن ایک اور طویل و عریض خط لکھ بھیجا اس خط میں ہم نے عطا کے والدین کی حالت زار کچھ ایسے جذباتی انداز میں رقم کی کہ خط لکھتے ہوئے ہاتھ لرز رہے تھے اور آنکھوں سے آنسو رواں تھے۔

یہ خط ارسال کرنے کے تین چار دن بعد بازار سے گزر ہوا تو قدم بے اختیار الصدف جنرل سٹور کی جانب مڑ گئے۔
چچا جان کاؤنٹر کے سامنے سر جھکائے بیٹھے دھیمی آواز میں عطا کا ایک کیسٹ سن رہے

تھے ہمیں دیکھتے ہی چونک کر پہلے تو آپنی آنکھوں میں تیرتے ہوئے آنسو آستین سے صاف کئے پھر ٹیپ ریکارڈ بند کر کے بڑے اشتیاق سے پوچھا:

"کوئی خبر ملی اس کی؟"

"جی ہاں چچا جان" ہم نے کہا "وہ کراچی میں ہے۔ میں نے اسے بڑا سخت خط لکھا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ یہ خط ملتے ہی وہ انشاء اللہ فی الفور واپس آ جائے گا۔"

"اللہ کرے۔" چچا جان نے ایک سرد آہ بھر کر بھرائی ہوئی آواز میں کہا اور ریکارڈ پلیئر پھر آن کر دیا۔ عطا کی آواز کمرے میں گونج اٹھی:

قبر اچ جاہ رکھساں متاں ڈھولا وی آنکلے

چچا جان کی آنکھیں پھر بھیگنے لگیں۔ مگر اب کی بار انہوں نے آنسوؤں کو چھپانے کی کوئی کوشش نہ کی کیونکہ ایسے ہی آنسو ہماری آنکھوں سے بھی رواں تھے۔

ہم دونوں ایک دوسرے کو تسلی دینے کے لئے کچھ کہنا چاہتے تھے، مگر الفاظ گرفت میں نہیں آ رہے تھے۔ ہم اسی ادھیڑ بن کے عالم میں مبتلا تھے کہ ماسٹر وزیر وارد ہوئے اور عطا کے بارے میں پوچھنے لگے۔ اس اچانک مداخلت پر چچا جان یک لخت بھڑک اٹھے۔۔

"تمہیں اس کی فکر کیوں کھائے جا رہی ہے۔ تم ہی لوگوں نے تو اسے اس نوبت تک پہنچایا ہے۔ (تم لوگوں سے مراد صرف ماسٹر وزیر نہیں بلکہ میں اور عطا کے تمام احباب تھے)

"تم لوگ اس کے اتنے خیر خواہ تھے تو اسے جانے کیوں دیا۔ تمہاری تو وہ ہر بات مانتا تھا۔ تم نے اسے روکا کیوں نہیں۔ مجھے بتاؤ کیوں نہیں روکا اسے؟"

ماسٹر وزیر تو سوالات کی اس یلغار کے آگے نہ ٹھہر سکے اور چلتے بنے مگر میں سر جھکائے مؤدب کھڑا رہا چچا جان ٹھیک ہی تو کہہ رہے تھے۔ ہم لوگ واقعی قصوروار تھے۔ اگر ہم ذرا سی عقل اور احتیاط سے کام لیتے تو عطاء کو اور اس کے گھر والوں کو یہ دن نہ دیکھنے پڑتے۔

چچا جان کا غصہ کچھ سرد ہوا تو ہم نے جانے کی اجازت چاہی۔ چچا جان نے بڑے پیار سے ہاتھ ہلاتے ہوئے کہا دیکھو بیٹے میری باتوں کا برا مت ماننا۔ پتہ نہیں کیوں آج میرے دل کی حالت کچھ عجیب سی ہو رہی ہے۔"

الصدف جنرل سٹور سے ہم سیدھے گھر واپس آئے۔ ابھی گھر میں قدم رکھا ہی تھا کہ دروازے پر دستک ہوئی۔ دروازہ کھولا تو عطا سامنے کھڑا تھا۔

"میں آ گیا ہوں لالا۔" اس نے ہم سے بغل گیر ہوتے ہوئے کہا۔

جواب میں کچھ کہے بغیر ہم حیرت سے اس کے سراپا کو دیکھ رہے تھے۔ عجیب حالت بنا رکھی تھی اس نے۔ جانے کراچی میں کیا کرتا رہا۔ سوکھ کر کانٹا ہو گیا تھا۔ چہرے پہ بیماری سی

زردی ' آنکھوں کے گرد سیاہ حلقے ' بال بکھرے ہوئے ' ناخن بڑھے ہوئے ۔ لباس میلا ' چیکٹ ' لباس سے بھی زیادہ میلا کچیلا ایک بڑا سا تھیلا کندھے سے لٹکائے وہ کتنا عجیب سا لگ رہا تھا۔ اس کی حالت دیکھ کر ایسے لگتا تھا جیسے ہفتہ بھر سے کھانا' پینا' سونا' کچھ بھی نصیب نہیں ہوا۔ بہر حال دل ہی دل میں ہم اللہ کا لاکھ لاکھ شکر ادا کر رہے تھے کہ جس حال میں سہی واپس تو آگیا۔

اپنی واپسی کا قصہ سناتے ہوئے اس نے کہا:

لالا جس وقت تمہارا خط ملا ' ایک دوست کے ہاں محفل موسیقی برپا تھی۔ بہت سے دوست جمع تھے۔ میں گا رہا تھا کہ تمہارا خط ملا۔ میں نے لفافہ کھولا خط کو وہیں ہارمونیم پر رکھ کر پڑھا اور اٹھ کھڑا ہوا۔۔۔۔۔

۔۔۔۔۔ اچھا دوستو خدا حافظ! میں نے کہا' پھر ملیں گے اگر خدا لایا۔۔۔۔ وہ لوگ حیران کہ اچانک یہ کیا ہو گیا۔ مگر میں نے کسی کو بتایا نہیں۔ آنسوؤں کو روکنے کی ناکام کوشش کرتا ہوا وہاں سے تیر کی سی تیزی سے نکلا۔۔۔ اپنی قیام گاہ پر جا کر سامان سمیٹا۔ وہاں سے سیدھا سٹیشن پر پہنچا اور گاڑی میں بیٹھ گیا۔ لالا کیا ظالم خط لکھا تھا تم نے!

عطا کی بخیریت واپسی پر اس کے گھر میں عید کا سا سماں بندھ گیا۔ امی اور بہنوں نے دو تین دن تک اسے باہر کی ہوا بھی نہ لگنے دی۔ کیا کیا خوشیاں منائی گئیں ' صدقے اور نذرانے بانٹے گئے۔ منتوں کی دیگیں پکائی گئیں۔ غرض یوں لگتا تھا کہ عطا آج ہی پیدا ہوا ہے۔ اہل خانہ کی مسرت کا اظہار دو تین میں مکمل ہوا تو عطا نے میکدے میں قدم رکھا اور آتے ہی پہلا سوال عذرا کے بارے میں پوچھا۔ معلوم ہوا کہ وہ چند روز قبل عیسیٰ خیل سے کوچ کر کے کہیں اور جا بسی ہے۔ مزید تحقیق و تفتیش سے اتنا پتہ چل سکا کہ وہ اٹک کے علاقے میں کہیں مقیم ہے۔ اٹک کون سا دور تھا؟ عطا وہاں بھی جا پہنچا' مگر اس کے ٹھکانے کا صحیح پتہ نہ چل سکا۔

عطا کے بزرگوں نے اسے راہ راست پر لانے کیلئے آخری حربے کے طور پر فی الفور اس کی شادی طے کر دی۔

عطا کی پہلی شادی کا ذکر مناسب حد تک تفصیل سے پہلے کر چکا ہوں۔ اس میں اتنا اضافہ یہاں برمحل ہو گا کہ بعض اطلاعات کے مطابق جب استاد امتیاز خالق سٹیج پر بیٹھے عطا کا سہرہ گا رہے تھے تو عذرا سامنے والی گلی میں ایک لمحہ کے لئے نظر آئی۔ اس نے دیوار کے اوپر سے ایک نظر جھانک کر عطا کو دیکھا اور پھر غائب ہو گئی۔ اور یوں سہرے کا یہ شعر سو فی صد سچا ثابت ہوا۔

سمیٹتا ہے گریباں کی دھجیاں کوئی
نظر جو پڑتی ہے اس تار تار سہرے پر

... اور سفر جاری ہے

محفلِ شب برہم شد

عیسیٰ خیل میں چند سیدھے سادے نوجوانوں نے نہ جانے کس کے مشورے پر راتوں رات امیر کبیر بننے کے ارادے سے ایک کمرشل جشن موسیقی منعقد کیا۔ پبلسٹی کے لئے بڑے بڑے پوسٹر چھپوا کر ضلع بھر میں اہم مقامات پر لگوائے گئے۔ ان پوسٹروں پر گلوکاروں کی ایک طویل فہرست جلی حروف میں درج تھی۔ سرفہرست نام عطاء اللہ خان عیسیٰ خیلوی کا تھا۔ اس کے بعد منصور علی ملنگی، شفیع اختر وتہ خیلوی، ایوب نیازی اور دیگر گلوکاروں کے اسمائے گرامی کی ایک لمبی قطار تھی۔ شو کے ٹکٹ ہاتھوں ہاتھ بکے۔ اہتمام پر دل کھول کر خرچ کیا گیا۔ سرگودھا کی ایک معروف ٹینٹ سروس سے فرنیچر اور دیگر سامان منگوایا گیا۔ روشنیوں کی بہار دیکھنے کے لائق تھی۔ سٹیج کی آرائش لاجواب، سٹیج کے قریب ایک چمکتے دمکتے شامیانے کے نیچے عالیشان صوفوں پر ضلعی انتظامیہ کے حکام اور معززین شہر تشریف فرما تھے۔ عوام الناس کا ہجوم حساب و شمار سے باہر تھا۔ مگر اس تمام تر طمطراق کے باوجود منتظمین کے ہاتھ کچھ نہ آیا، کیونکہ عین موقع پر ایکسائز والوں نے سب کچھ یہ کہہ کر ہتھیا لیا کہ اس تقریب کے لئے ان سے پیشگی اجازت نہیں لی گئی تھی۔ ادھر یہ آفت ٹوٹی ادھر تقریب شروع ہوتے ہی لاؤڈ سپیکر نے جواب دے دیا۔ ایوب نیازی نے ابھی گیت کا دوسرا بند بھی مکمل نہیں کیا تھا کہ آواز غائب۔ سامعین کا احتجاج تالیوں سے شروع ہو کر گالیوں کی حدود میں داخل ہوا تو لاؤڈ سپیکر کا دماغ بھی درست ہو گیا۔ ایوب نیازی

صاحب نے ان حالات میں فن کا مظاہرہ کرنے سے معذرت کر دی تو سٹیج سیکرٹری (ہم ہی تھے) نے منصور علی ملنگی صاحب کی منت سماجت کر کے انہیں سٹیج پہ لا بٹھلیا۔ تقریباً ڈیڑھ گھنٹہ انہوں نے سامعین کو خوب محظوظ کیا۔ ان کے بعد شفیع اختر وتہ خیلوی میدان میں اترے۔ ادھر انہوں نے گیت شروع کیا ادھر لاؤڈ سپیکر کا مزاج پھر سے بگڑ گیا۔ وہ سٹیج سے رخصت ہوئے، تو ہم نے ایک بار پھر منصور علی ملنگی صاحب کو سٹیج پر لانے کے لئے جدوجہد شروع کر دی۔ بہ صد مشکل وہ رضامند ہوئے تو لاؤڈ سپیکر بھی راہ راست پہ آ گیا۔ مگر اب سامعین عطا کو سٹیج پہ لانے کا تقاضا کر رہے تھے۔ اور عطا نہ جانے کہاں غائب ہو گیا تھا۔ منصور علی ملنگی جب پہلی بار گا رہے تھے تو اس وقت عطا سٹیج کے عقب میں کھڑا انہیں بے تحاشا داد دے رہا تھا۔ اس کے بعد نہ جانے کس وقت کدھر غائب ہو گیا۔ منتظمین کے پسینے چھوٹنے لگے۔ بتیہرا ڈھونڈا مگر وہ گرد و نواح میں کہیں ہوتا تو ہاتھ لگتا۔ یہ انکشاف بہت دیر بعد میں ہوا کہ وہ اچانک کسی ضروری کام سے کمر مشانی سدھار گیا تھا۔ پندرہ بیس منٹ کے شریفانہ احتجاج پر عطا سامنے نہ آیا تو سامعین جارحیت پر اتر آئے۔ سب سے پہلے کسی ستم ظریف نے اس شامیانے کی طناب کاٹی جس کے نیچے حکام اور معززین تشریف فرما تھے۔ شامیانہ لہراتا بل کھاتا ان کے سروں پہ آ گرا اور اس کے ساتھ ہی بجلی کی رو بھی داغ مفارقت دے گئی۔ وسیع و عریض پنڈال تاریکی میں ڈوب گیا۔ عجیب نفسانفسی کا عالم تھا۔ اس نفسانفسی کے عالم میں جس کے ہاتھ جو کچھ لگا اٹھا کر چلتا بنا۔ بعد میں حساب لگایا گیا تو معلوم ہوا کہ بیشتر دریاں، ایک آدھ شامیانہ، درجن بھر بانس، اتنی ہی ٹیوب لائٹیں اور دو ڈھائی درجن بلب غائب ہیں۔

اس سانحے سے گذر کر ہم عطا کی تلاش میں اس کے گھر پہنچے تو وہ میکدے میں موجود تھا۔

"کیوں صاحب! یہ کہاں کی شرافت ہے؟" ہم نے جلے بھنے لہجے میں غرا کر کہا۔

"بات یہ ہے بھائی!" عطا نے بڑے اطمینان سے جواب دیا "کہ سٹیج کے قریب مجھے ایک دو حضرات ایسے نظر آئے جن سے خاندانی رنجشوں کی بنا پر میرا وہاں ٹھہرنا مناسب نہ تھا۔۔۔۔۔" یہ معقول جواب سن کر ہمارا غصہ ٹھنڈا پڑ گیا اور پھر ہم نے اس تقریب کے عبرت ناک انجام کی تفصیلات الف سے یے تک ایک ہی سانس میں سنا ڈالیں۔ عطا کو اس واقعہ پر سخت صدمہ ہوا اور وہ کئی دن تک مغموم رہا۔

جگن ناتھ آزاد کے ساتھ ایک شام

۱۹۸۰ء میں جگن ناتھ آزاد اپنی جنم بھومی (عیسیٰ خیل) کی یاترا کے لئے آئے تو ان کے اعزاز میں خان والی داد خان رئیس اعظم عیسیٰ خیل کی کوٹھی کے وسیع و عریض لان میں موسیقی کی ایک خصوصی محفل بھی منعقد ہوئی جس میں جگن ناتھ آزاد اور ان کے والد (شہرۂ آفاق شاعر تلوک چند محروم) کا کلام عطا نے نہایت سلیقے سے پیش کیا۔ اپنے آبائی شہر میں اپنے آنجہانی والد کا کلام اپنے ہی شہر کے ایک گلوکار کی پرسوز آواز میں سن کر جگن ناتھ آزاد اپنی آنکھوں میں اُمڈتے آنسوؤں پر قابو نہ پا سکے۔ اور یہ آنسو غم کے نہیں، غم اور خوشی کے ملے جلے آنسو تھے۔ غم اپنے ماضی سے بچھڑنے کا۔ غم ان غمگسار چہروں کی جدائی کا جو ان کی طویل غیر حاضری کے دوران اس دنیائے فانی سے رخصت ہو چکے تھے اور خوشی اس بات کی، کہ چالیس سال کی جلاوطنی کے بعد قدرت نے انہیں ایک بار پھر اپنے وطن آکر اپنے بچپن کے ساتھیوں میں مل بیٹھنے کا موقع عطا کیا تھا۔

جگن ناتھ آزاد نے عطا کے فن کو بہت سراہا۔ خاص طور پر وہ لوک گیت جو وہ بچپن میں سنا کرتے تھے ایک طویل عرصہ کے بعد پھر سن کر ان پر ایک عجیب سا کیف طاری ہو گیا۔ وہی کیف جو وہ بچپن میں محسوس کیا کرتے تھے۔ انہوں نے بڑے پیار سے عطا کو گلے لگایا اور اسے بھارت کا دورہ کرنے کی دعوت دی۔ عطا نے اپنے کیسٹوں کا ایک مکمل سیٹ ان کی نذر کیا۔

کچھ عرصہ بعد جموں سے ایک خط میں جناب جگن ناتھ آزاد نے لکھا کہ بھارت میں رہنے والے میانوالی کے تارکین وطن عطا کے کیسٹ بڑے شوق سے سنتے ہیں اور ان کیسٹوں کے باعث ان کے گھر میں ایک میلہ سا لگا رہتا ہے۔

اپنی مٹی سے محبت ایک نہایت پاکیزہ جذبہ ہے جس کی قوت اور شدت کا احساس وطن سے دور دیارِ غیر میں جا کر ہوتا ہے۔ وطن سے ہزاروں میل دور اجنبی ماحول میں ایک ہم وطن سے اچانک ملاقات ایک غریب الوطن کے لئے دنیا کی سب سے بڑی نعمت کا درجہ رکھتی ہے۔ دیدہ و دل فرش راہ کر کے بھی انسان کو یہ احساس ستاتا رہتا ہے کہ ؎

حق تو یہ ہے کہ حق ادا نہ ہوا

عطا جب یورپ کے دورے سے واپس آیا تو ناروے میں اپنے قیام کو اس طویل سفر کا سب سے خوشگوار حصہ قرار دیا۔ وجہ یہ تھی کہ وہاں جو محبت اسے ہرچرن چاولہ کے ہاں ملی اس کے تصور اور توقعات سے کہیں زیادہ تھی۔ آپ کو یاد ہو گا کہ ہرچرن چاولہ بھارت کے ایک نامور افسانہ نگار ہیں۔ ان کا آبائی وطن میانوالی ہے۔ ان دنوں ناروے کے

شہر اوسلو میں مقیم ہیں۔ عطا نے بتایا کہ ناروے میں بھی ہرچرن چاولہ نے اپنے گھر میں ایک ننھا سا میانوالی آباد کر رکھا ہے۔ یہی زبان' یہی معاشرت' یہی لباس' یہی خلوص' یہ مہمان نوازی' غرض سب کچھ وہی ہے جو وہ چالیس سال قبل یہاں سے لے گئے تھے۔ ہرچرن چاولہ نے عطا کو اوسلو اور گرد و نواح کے تمام علمی' ادبی و ثقافتی حلقوں میں بڑے فخر سے متعارف کرایا۔ وہاں کے ایک اردو اخبار اور مقامی زبان کے متعدد اخبارات و رسائل میں عطا کے انٹرویو شائع کرائے اور اس کے اعزاز میں جگہ جگہ تقریبات منعقد کرائیں۔

بعض اچانک ملاقاتیں معجزے سے کم نہیں ہوتیں۔ انسان کے وہم و گمان میں بھی نہیں ہوتا کہ فلاں جگہ فلاں صاحب سر راہ چلتے چلتے مل جائیں گے۔ مگر ایسا اکثر ہوتا ہے' حیرت اور مسرت سے انسان پاگل ہوا جاتا ہے۔ سمجھ میں نہیں آیا کہ اس ذات کارساز کا شکر کس طرح ادا کیا جائے جس نے یوں اچانک ناممکن کو ممکن بنا دیا۔

عطا اور ہرچرن چاولہ کی ایک ایسی ہی ملاقات ۱۶ فروری ۱۹۸۸ء کی ایک شام شہزاد ہوٹل میانوالی میں ہوئی۔ جب ہرچرن چاولہ کی اچانک میانوالی آمد پر میانوالی اکیڈیمی کے احباب نے شہزاد ہوٹل میں ان کے ساتھ ایک شام منائی۔ ہم سب لوگ ہرچرن چاولہ کے ہمراہ شہزاد ہوٹل پہنچے تو معلوم ہوا کہ عطا ابھی چند منٹ پہلے یہاں پہنچا ہے۔ تقریب کے بارے میں اسے کوئی علم نہ تھا۔ وہ تو بس عیسیٰ خیل سے لاہور جاتے ہوئے بعض دوستوں سے ملنے کے لئے گھڑی بھر کو وہاں رکا تھا۔ یہ اتفاق تو اس کے خواب و خیال میں بھی نہیں آیا ہوگا کہ دنیا کے آخری سرے (ناروے) سے بھی ایک دوست اس سے ملنے وہاں پہنچ جائے گا۔ ہرچرن چاولہ اپنے سفرنامے میں اس ملاقات کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"۔۔۔ میں پورنیما' سلیم بھائی' منور علی ملک اور ایاغ صاحب کے ہمراہ تیز قدموں سے ہال کی طرف دوڑتا ہوں' مگر مجھے راستے ہی میں ایک کمرے میں کھینچ لیا جاتا ہے۔ چھ سات لوگ بیٹھے چائے پی رہے ہیں۔ سب سے گلے ملتا ہوں۔ آخری شخص نہ گلے ملتا ہے نہ مصافحہ کے لئے ہاتھ ہی بڑھاتا ہے۔ وہ نخرہ کر رہا ہے۔ میں اسے کھینچ کر گلے لگا لیتا ہوں۔ وہ شخص یہ دیکھنے کو رکا تھا کہ میں اسے پہچانتا بھی ہوں کہ نہیں۔ مگر میں نے اسے پہچان لیا' اس لئے اس قدر زور سے بھینچ کر گلے لگایا ہے کہ میری اپنی ہڈیاں چرمراٹھی ہیں۔ عمروں کا فرق ہے بھئی۔ عطا عیسیٰ خیلوی پاکستان کا نمبر ون نوجوان سرائیکی گلوکار۔ اس نے سرائیکی کو نہ صرف پاک و ہند بلکہ بیرونی ممالک میں بھی متعارف کرایا ہے اور شہرت دی ہے۔ اس کی آواز میں بلا کا درد اور جادو ہے۔ اس لئے اسے بجا طور پر درد کا سفیر کہا جاتا ہے۔ یہ درد اسے عشق میں ناکامی (؟) سے عطا ہوا ہے۔ سرائیکی کے لوگ گیت اس کی زبان سے

پھولوں کی طرح جھڑتے ہیں۔ وہ غزلیں بھی کمال فن سے گاتا ہے۔ اگست ۱۹۸۳ء میں وہ ناروے پروگرام دینے آیا تھا تو ہم وطن ہونے کے ناطے غریب خانے پر بھی تشریف لایا تھا۔ آج وہ اپنی ڈیڑھ سالہ بیمار بیٹی کو عیسیٰ خیل سے لاہور لے جا رہے تھے۔ میانوالی میں کسی دوست کے ہاں رکے اور میز پر شام کے اس جلسے کا کارڈ دیکھا تو مجھے ملنے کو رک گئے۔ قریباً ڈیڑھ گھنٹے سے میرا انتظار کر رہے تھے۔۔۔۔۔۔"

کالا شاہ بدلا ناں وس۔۔۔

ستمبر ۱۹۸۱ء میں پی اے ایف کالونی میانوالی میں ایک یادگار محفل موسیقی منعقد ہوئی۔ سرگودھا اور بھکر تک کے لوگ عطا کو سننے کے لئے اس محفل میں شریک ہوئے۔ اس محفل کی ایک خصوصیت یہ بھی تھی کہ اس میں میکدے کے سب ساتھی موجود تھے۔ شاید یہی وجہ تھی کہ عطا نے بے حد دل لگا کر گایا۔۔۔ سامعین کا رسپانس (Response) بھی دیکھنے سے تعلق رکھتا تھا۔ خاص طور پر "بودی چھنگا ڑنگ ڑنگ" والے گیت پر ایک میجر صاحب کا بارودی رقص تو ہمیشہ یاد رہے گا۔

محفل رات کے پچھلے پہر تک جاری رہی۔ عطا نے سامعین کی فرمائش پر متعدد نئے اور پرانے گیت پیش کئے۔ آخر میں اس نے 'یونس خان مرحوم کا گیت۔

کالا شاہ بدلا ناں وس توں ساڈے دیس

چھیڑا تو سرشام سے چھائے ہوئے بادل کو شرارت سوجھی اور فوراً چھم چھم برسنے لگا۔۔۔ اس گیت میں کوئی مجبور دوشیزہ آسمان پر چھائے بادل سے التجا کرتی ہے کہ اے بادل تجھے میری مجبوریوں کی قسم تو فی الحال نہ برس کہ ابھی میرا محبوب پردیس سے واپس نہیں آیا۔ بس اسے آجانے دے 'پھر جتنا جی چاہے' برس لینا۔۔۔ بادل کی ستم ظریفی نے اس گیت کو ایک عجیب رنگ دے دیا کہ ادھر عطا سسک کر منتیں کر رہا تھا۔

کالا شاہ بدلا ناں وس توں ساڈے دیس

جھوکاں تھیسن آباد ول۔۔۔

۱۹۸۳ء میں عطا برطانیہ کے دورے سے واپس آیا تو ایک دن اچانک میانوالی میں گلشن سینما کے قریب ملاقات ہو گئی۔ باتوں باتوں میں مجھے یاد آیا کہ میانوالی اکیڈیمی کے

احباب (بھائی سلیم احسن ' محمد فیروز شاہ وغیرہ) ایک عرصہ سے عطا کے ساتھ ایک شام منانے کا ارادہ کر رہے تھے ۔ عطا کو دعوت دی تو کہنے لگا ۔ " آئندہ جمعرات کی شام کو آؤں گا ' مگر شرط یہ ہے کہ تم آج میرے ساتھ عیسیٰ خیل چلو ۔ پرسوں مجھے واپس جانا ہے ۔ میں چاہتا کہ کم از کم ایک رات میکدہ پھر آباد ہو جائے ۔ سب پرانے دوست اکٹھے ہوں گے ۔ "

اس دن چونکہ مجھے کوئی ضروری کام تھا ' لہٰذا میں نے معذرت کرتے ہوئے اگلے دن عیسیٰ خیل جانے کا وعدہ کر لیا ۔

اگلے دن میں ایک دوست (اقبال کوچوان) کو ہمراہ لے کر سرشام عیسیٰ خیل پہنچ گیا ۔ میکدے میں شام کا کھانا کھایا ۔۔۔ توقع تھی کہ اب یاران میکدہ حسب معمول ترتیب سے ایک ایک کر کے آئیں گے ' اور پھر موسیقی کی محفل رات گئے تک چلے گی ۔ مگر ہوا یہ کہ عطا کے چند بزرگ تشریف لائے ' اور ادھر ادھر کی باتوں میں ایسے الجھے کہ رات کا ایک بجنے لگا ' مگر ان کی بحث ختم ہونے کے آثار حد نظر تک دکھائی نہ دیتے تھے ۔ یاران میکدہ بیٹھے دانت پیس رہے تھے ۔ ایک ایک کر کے چلتے بنے کہ ۔

یہاں تو بات کرنے کو ترستی تھی زبان ان کی

ہاتھ اور زباں باندھ کر مؤدب بیٹھے رہنے کی بھی کوئی حد ہوتی ہے ۔ عطا نے اور ہم نے آنکھوں ہی آنکھوں میں یہ طے کیا کہ یہاں سپئیر پارٹس بن کر بیٹھے رہنے سے تو بہتر ہے کہ بس سٹینڈ پر جا کر ایک ایک پیالی چائے کی پی لی جائے ۔

عطا نے گاڑی نکالی اور ہم بس سٹینڈ کی جانب روانہ ہوئے ۔ عقیل عیسیٰ خیلوی اور ماسٹر وزیر ہم رکاب تھے ۔ چائے پینے کے بعد بھی احتیاطاً ہم لوگ ڈیڑھ دو گھنٹے وہیں بیٹھے رہے کہ مبادا بزرگ حضرات ابھی فارغ نہ ہوئے ہوں ۔

تقریباً تین بجے ہم ڈرتے ڈرتے واپس آئے تو میدان خالی تھا ۔ اطمینان کا سانس لینا اس لئے مناسب نہ سمجھا کہ جس محفل کے ارادے ہم نے باندھے تھے اس کا اب نہ وقت تھا ' نہ محل ۔۔۔ عطا کی انگلینڈ والی دلہن اسی دن عطا کے ہمراہ پہلی بار سسرال آئی تھیں ۔ ہم نے سوچا کہ وہ بھی کیا کہیں گی کہ عطا کیسے لفنگے دوستوں کے ہاتھ آ گیا ہے جو صبح سے پہلے اسے گھر کا منہ ہی نہیں دیکھنے دیتے ۔ لہٰذا ہم نے بڑی فراخ دلی سے عطا کو تو چھٹی دے دی اور خود میکدے میں (پہلی بار چارپائیوں پر) سونے کی تیاریوں میں لگ گئے ۔ مگر ابھی تیاریوں سے فارغ نہ ہوئے کہ عطا تکیہ بغل میں دابے واپس آ گیا ۔ ہماری قہر آلود نگاہیں بھانپ کر کہنے لگا ۔

" یار ! اتنی مدت کے بعد ملے ہیں ' مگر جی بھر کے باتیں بھی نہ کر سکے ۔ سونے کو تو

ساری عمر پڑی ہے، آؤ آج رات باتیں کرتے کرتے صبح کردیں۔ تجویز معقول تھی۔ نہ بھی ہوتی تو ہم کون سا نیند سے مرے جا رہے تھے۔ سو ہم فوراً اٹھ بیٹھے اور بیتے دنوں کی راکھ کو کریدتے کریدتے اس میں سے ایک نیا دن ڈھونڈ نکالا۔ اس نئے دن کا زیادہ تر حصہ وی سی آر پر انڈین فلمیں دیکھتے بسر کیا۔ مجھ پر ترس کھاتے ہوئے عطا نے صرف سیدھی سادھی باپردہ قسم کی فلمیں (کرما، قلی) وغیرہ ہی دکھانے پر اکتفا کیا۔ ورنہ گلشن میں علاج تنگئی داماں بھی تھا۔

دوپہر کے بعد ہم عطا سے آئندہ جمعرات کو میانوالی آنے کا وعدہ لے کر رخصت ہوئے۔

ڈسٹرکٹ کونسل ہال کا پروگرام

تاریخ یاد نہیں۔ جمعرات کی شام تھی۔ عطا حسب وعدہ تقریباً سات بجے میرے ہاں پہنچ گیا۔ ساز اور ساؤنڈ سسٹم وغیرہ کے لوازمات ہمراہ تھے۔ بھائی سلیم احسن فیروز شاہ اور دوسرے احباب کے معیت میں ہم سب تقریباً ۹ بجے ڈسٹرکٹ کونسل ہال پہنچے۔ عوام الناس کے بے قابو ہجوم سے بچنے کے لئے ہم نے اس تقریب کو صیغہ راز میں رکھا۔ صرف پینتیس چالیس اہل ذوق کا اجتماع تھا۔ تقریب کے پہلے دور میں احباب نے عطا کے فن اور شخصیت کے حوالے سے گفتگو کی۔ فیروز شاہ نے عطا کو میانوالی کا شناختی کارڈ قرار دیا۔ منصور آفاق، ندیم حیدر بلوچ اور ڈاکٹر اجمل نیازی نے عطا کے فن کے بارے میں گفتگو کی۔ اور پروفیسر سلیم احسن نے اپنے مخصوص رنگ میں سرائیکی میں منظوم خراج تحسین عطا کی نذر کیا۔

دس بجے کے قریب عطا نے پیر فرید فقیر کے کلام سے محفل نغمہ کا آغاز کیا۔

نہ مار نیناں دے تیرے وے توں سانولا

اس کے بعد فرمائشوں کا سلسلہ شروع ہوا۔ عطا نے حسب عادت ہر فرمائش پوری کی۔ پھر اپنی پسند کے کچھ گیت سنائے۔ اول سے آخر تک اس نے بہت ڈوب کر گایا۔ اسے قریب سے جاننے والے لوگ جانتے ہیں کہ کسی تقریب کے دوران اس کا موڈ بن جائے تو وہ اس انداز سے مسلسل گاتا ہے کہ محفل ختم کرنے کو نہ اس کا جی چاہتا ہے، نہ سامعین کا۔ کچھ ایسی ہی کیفیت اس محفل میں بن گئی۔ سازندوں کے پسینے چھوٹ رہے تھے۔ طبلہ نواز نے میرے کان میں کہا: "لالا، تین راتوں کا رت جگا ہے، میرے ہاتھ شل ہو چکے ہیں۔

خدارا کسی طرح لالا کو رکنے پر آمادہ کرو۔" میں نے عطا کو اس صورت حال سے مطلع کیا۔ اس نے مسکرا کر طبلہ نواز کے پسینے میں شرابور چہرے پر ایک نظر ڈالی اور محفل کے ختم ہونے کا اعلان کر دیا۔ صبح کے تین بج رہے تھے۔ سامعین بادل ناخواستہ گھروں کو روانہ ہوئے اور ہم اپنے گھر کو لوٹے۔ عطا اور اس کے ساتھیوں نے شام کا کھانا (صبح ۴ بجے) کھایا۔ کھانا کیا تھا' گھر میں شام سے پکا ہوا جو کچھ موجود تھا وہی گرم کر کے کھا لیا کیونکہ عطا نے تکلفات سے سختی سے منع کر دیا تھا۔ کھانے سے فارغ ہوتے ہی فاروق قریشی صاحب کے ہاں کندیاں جانے کا پروگرام بن گیا اور ہم سب کندیاں چلے گئے۔ رات کے آخری لمحات وہاں سونے کی کوشش کرنے میں تمام ہوئے اور علی الصبح ناشتہ کرنے کے بعد عطا مجھے واپس میانوالی پہنچا کر لاہور چلا گیا۔

یہ ساری تفصیل عرض کرنے کا مقصد یہ ہے کہ شہرت اور مقبولیت کے اس بلند و بالا مقام پر پہنچ کر بھی عطا اپنے پرانے دوستوں کو بھولا نہیں۔ ذرا غور کیجئے کہ ایک عالمی شہرت کا گلوکار' محض ایک دوست کو خوش کرنے کے لئے لاہور سے میانوالی آیا۔ آمد و رفت کا خرچ اور سازندوں کا معاوضہ اپنے پلے سے ادا کیا اور مسلسل چار پانچ گھنٹے تک فن کا مظاہرہ کرنے کے بعد روکھی سوکھی روٹی کے چند لقمے کھا کر چلا گیا۔ صرف یہی نہیں' میانوالی کی اس محفل کے لئے اس نے اپنی تمام تر Appointments بھی بالائے طاق رکھ دیں۔ اس دور میں ایسا خلوص اس قدر کم یاب ہے کہ تشنگان خلوص جاں بہ لب ہیں۔

عطا کے پاس خلوص کی فراوانی اپنی جگہ' اس خلوص سے ناجائز فائدہ اٹھانے والے کرم فرماؤں کی بھی کمی نہیں۔

بہت عرصہ ہوا میرے ایک واقف کار واہ فیکٹری سے عیسیٰ خیل وارد ہوئے۔ میں ان دنوں داؤ خیل میں مقیم تھا۔ وہ صاحب سیدھے عطا کے ہاں پہنچے اور مجھ سے اپنے قریبی تعلق کا حوالہ دے کر عطا کو واہ میں ایک شادی کی تقریب میں شمولیت کی دعوت دی۔ شادی ان کے کسی دوست کے کسی عزیز کی تھی۔ اس عزیز کے ایک بزرگ بھی ان کے ہمراہ تھے۔ عطا نے میری وجہ سے معاوضے کا تقاضا نہ کیا' مگر ان صاحب نے از خود معاوضہ مقرر کر کے نصف رقم پیشگی دے دی۔ کاروباری اعتبار سے یہ معاوضہ عطا کے لئے خاصا خسارے کا سودا تھا' مگر اس نے یہ سودا بخوشی قبول کر لیا' اور طے شدہ پروگرام کے مطابق واہ پہنچ گیا۔ دو تین گھنٹے حاضرین کو اپنے فن سے محظوظ کرنے کے بعد جب منتظمین سے واپسی کی اجازت چاہی تو انہوں نے کہا "کیسی واپسی صاحب! شادی تو کل ہو گی' اور ہم نے دو دن کے

پروگرام کا معاوضہ طے کیا تھا۔"
عطا کو طیش آگیا' پیشگی لی ہوئی رقم جیب سے نکال کر ان کے منہ پر دے ماری اور فوراً گاڑی میں بیٹھ کر گھر واپس آگیا۔

ہم ان کے مہمان ہوئے۔۔۔

۱۹۸۰ء کے آخری دنوں میں عطا نے اپنے چھوٹے بھائی ثناء اللہ خان (شنو بھرا) کو بھیج کر مجھے فیصل آباد بلوایا۔ وہاں پہنچ کر اس اچانک طلبی کی وجہ پوچھی تو جواب ملا "بس یونہی۔۔۔ ملنے کو جی چاہ رہا تھا۔ صبح تھوڑی سی ریکارڈنگ کرنی ہے اس کے بعد اسلام آباد چلیں گے"۔

رات رحمت گراموفون ہاؤس کی سب سے اوپر والی منزل پر ایک وسیع و عریض' آراستہ پیراستہ کمرے میں بسر کی۔ علی الصبح معروف گلوکار منصور علی ملنگی بھی وہاں آ پہنچے۔ وہ رات بھر فیصل آباد میں کسی شادی کی تقریب میں نغمہ سرائی کر کے آ رہے تھے۔ ان کے ہمراہ دو آدمی تھے۔ ایک نے ہارمونیم اٹھا رکھا تھا' دوسرے نے ایک گٹھڑی۔ دری پر بیٹھ کر انہوں نے گٹھڑی کھولی۔۔۔ نوٹ ہی نوٹ۔ ایک روپے سے لے کر سو روپے تک کے نوٹوں کا اچھا خاصا پلندہ۔ یہ تمام تر دولت ایک رات کی گلوکاری کا صلہ تھی۔ وہ صاحب نوٹ گننے میں لگ گئے تو عطا نے منصور علی ملنگی سے کہا۔ "یہ ساری کمائی۔

کار چلاوے کوئی ہور

سے ہوئی نا۔"

اشارہ منصور ملنگی کے ایک انتہائی مقبول گیت کی طرف تھا۔ جس کے بول۔

ماہی تاں میڈا بھوں ملوک اے
کار چلاوے کوئی ہور

پر انہیں بے تحاشا داد ملتی تھی۔

منصور علی ملنگی نے اعتراف کیا کہ واقعی یہ تمام رقم اسی گیت پر داد کی صورت میں ملی تھی۔

پھر عطا نے کہا: "لالا تمہیں سننے کے لئے تمہاری تقریب میں ضرور آتا' مگر میانوالی سے کچھ دوست آگئے اور مجھے رکنا پڑ گیا۔"

منصور نے جل کر جواب دیا: "شکر ہے تم نہیں آئے۔ میرے یہ چار پیسے بھی تم

سے نہیں دیکھے جاتے۔ کم بخت اگر تم وہاں نازل ہو جاتے تو مجھے کون سنتا۔"

یہ دلچسپ چھیڑ چھاڑ کچھ دیر چلتی رہی۔ پھر ہم سب نے ناشتہ کیا۔ منصور علی ملنگی جھنگ روانہ ہوئے اور ہم ریکارڈنگ انجینئر محمود بھائی کے ہمراہ ان کے سٹوڈیو کی طرف چل پڑے۔ ریکارڈنگ ہوئی' عطا کا مشہور گیت۔

کپڑا ڈوریئے دا پتاں تے لوہڑ آئی آں

اسی موقعہ پر ریکارڈ ہوا۔ تقریباً چار گھنٹے کی اس مسلسل ریکارڈنگ میں ہم بیٹھے بیٹھے تھک گئے' مگر عطا متواتر چار گھنٹے گانے کی عرق ریزی کے باوجود ہشاش بشاش تھا۔ تاہم ہمارے لئے یہ کوئی حیرت کی بات نہ تھی۔ عطا اس سے پہلے تقریباً بارہ گھنٹے کی لگاتار ریکارڈنگ کا ریکارڈ قائم کرچکا تھا۔

میرے چھوٹے بھائی شوکت علی ملک فیصل آباد کی فرٹیلائز فیکٹری میں ملازم ہیں۔ وہ بھی اس موقع پر ہمارے ساتھ تھے۔ ریکارڈنگ ختم ہوئی تو انہوں نے ہمیں اپنے ساتھ فیکٹری لے جانے کے لئے اصرار کیا۔ اصرار کی ایک وجہ یہ تھی کہ ان کی فیکٹری کے مزدور ایک عرصہ سے عطا کو ایک نظر دیکھنے کے خواہاں تھے۔

عطا کی گاڑی میں ہم فیکٹری پہنچے۔ شوکت کے کوارٹر پر چائے وغیرہ پی۔ آنے جانے والوں کا تانتا بندھ گیا۔ ہم تقریباً ایک گھنٹہ وہاں ٹھہرے' مگر لوگوں کا ہجوم ایک لمحہ کو بھی کم نہ ہوا۔ اس کے باوجود جب ہم روانہ ہوئے تو بے شمار مزدور جو کسی وجہ سے بروقت نہ پہنچ سکے' دور دور تک کھڑے ہاتھ ہلا ہلا کر عطا سے اپنی محبت کا اظہار کرتے رہے۔ ایک حسرت بھری مسکراہٹ ان سب کے چہروں پر دیکھ کر بے اختیار میری پلکیں بھیگنے لگیں۔ ان کی یہ معصوم مسکراہٹ یہ کہتی معلوم ہوتی تھی کہ "لالا' ہماری بدنصیبی کہ تمہیں قریب سے دیکھنے کے لئے بروقت نہ پہنچ سکے۔ مگر یہی کیا کم ہے کہ دور سے سہی' تمہیں اپنے گھر میں دیکھ تو لیا۔ اب ہم بڑے فخر سے لوگوں کو یہ بتا سکیں گے کہ عطاء اللہ خان عیسیٰ خیلوی ہماری فیکٹری میں بھی آیا تھا۔"

میری نظر میں عطا کی مقبولیت کا یہ مظاہرہ کوئی معمولی واقعہ نہیں۔ عطا کے یہ شیدائی وہ کم نصیب لوگ تھے جنہیں دن رات کی محنت شاقہ کے صلے میں یہ معاشرہ صرف دو وقت کی روٹی دیتا ہے۔ وہ بھی اتنی کم' کہ خود کھائیں تو بچے بھوکے رہ جائیں۔ اس لئے یہ لوگ بسا اوقات ناشتہ کئے بغیر علی الصبح گھر سے نکلتے ہیں اور فیکٹری کی کنٹین سے دس پیسے میں بدذائقہ چائے کی ایک پیالی پی کر کام میں لگ جاتے ہیں۔ اگر جیب میں پیسے ہوں تو چائے کی ایک اور پیالی پی کر دوپہر کے کھانے کی ضرورت پوری کر لیتے ہیں' ورنہ بھوکے ہی

شام تک مشقت میں مشغول رہتے ہیں --- پیار ' محبت اور احترام جیسی نایاب چیزیں ان کی دسترس سے ہمیشہ باہر رہتی ہیں۔

ان لوگوں کی عطا سے اس قدرت محبت! اللہ کی شان ہے۔ اس محبت کی وجہ سمجھ میں نہیں آتی --- شاید وہ عطا سے اس لئے محبت کرتے ہوں کہ وہ ان کی محرومیوں اور مجبوریوں کا شکوہ ان الفاظ میں اللہ کے حضور میں پہنچاتا ہے۔

شکوہ اپنوں سے کیا جاتا ہے ' غیروں سے نہیں

اور شکوہ وہ کرتا ہے جو اس کے وجود اور اس کے اختیارات پر یقین رکھتا ہو۔ لہذا شکوہ اگر خلوص دل سے کیا جائے تو کارگر ثابت ہو سکتا ہے۔ یہ باتیں شاید آپ کی سمجھ سے بالاتر ہوں ' مگر ان لوگوں کی سمجھ سے بالاتر نہیں جن کا ذکر میں کر رہا ہوں ---

عطایوں تو ہر طبقے میں مقبول ہے مگر اس کے زیادہ تر شیدائی مفلوک الحال ' مظلوم اور مجبور لوگ ہی ہیں۔

سفر ہے شرط ---

فیکٹری سے ہم سیدھے براستہ گوجرانوالہ ' اسلام آباد روانہ ہوئے۔ راستے میں گوجرانوالہ (غالباً سٹلائیٹ ٹاؤن میں) عطا کے بعض عزیزوں کے ہاں کچھ دیر کے لئے رکے۔ دوپہر کا کھانا وہیں کھایا (وقت عصر کا تھا ' مگر کھانا دوپہر کا)۔ موسم بے حد خوشگوار تھا۔ ہلکی ہلکی پھوار پڑ رہی تھی۔ گاڑی میں لگے ہوئے ٹیپ ریکارڈ پلیئر پر کشور کمار کا مشہور گیت:

تیرے بنا بھی کیا جینا

غضب ڈھا رہا تھا۔ اور ہم بار بار ٹیپ کو Rewind کر کے یہ گیت سن رہے تھے۔ کھاریاں سے کچھ آگے نکلے تو اچانک گاڑی کے آگے لگا ہوا گرل (Grill) نکل گیا۔ شام کا سرمئی اندھیرا تیزی سے رات کی سیاہی میں جذب ہو رہا تھا۔ ہم گھبرا گئے کہ اب کیا ہو گا۔ آبادی سے کوسوں دور ' رات کی تاریکی میں گاڑی کی اس اچانک ناسازی طبع کی چارہ گری کون کرے گا؟

"کوئی بات نہیں۔" عطا نے بڑے اطمینان سے کہا۔ "وہ سامنے میرے ایک دوست کا پولٹری فارم ہے۔ وہاں ہمیں سب کچھ مل جائے گا۔"

ہم نے مڑ کر دیکھا تو واقعی چند قدم کے فاصلے پر ' سڑک کے بائیں جانب ایک

پولٹری فارم تھا۔ پھر بھی ہمیں یہ فکر ضرور لاحق رہی کہ اس جنگل بیابان میں کار کی مرمت کا سامان کہاں سے آئے گا کیونکہ کار کی مشینری مرغی کی مشینری سے ذرا مختلف ہوتی ہے۔ مثلاً ہمیں کار کے لئے چند چھوٹے سائز کے پیچ درکار تھے' جو ظاہر ہے کہ مرغیوں کی ساخت میں کہیں بھی استعمال نہیں ہوتے۔

بہرحال عطا کا اندازہ غلط نہ تھا۔ عطا کے مرغبان دوست کی اپنی گاڑی وہاں موجود تھی اور اس کے فالتو پرزوں میں ہمارے کام کی سب چیزیں بڑی آسانی سے مل گئیں۔ صرف یہی نہیں بلکہ چائے پانی سے ہماری تواضع بھی خوب ہوئی' اور ہم ترو تازہ' ہشاش بشاش' ہنستے کھیلتے وہاں سے رخصت ہوئے۔

تیز رفتاری ہمیں ایک آنکھ نہیں بھاتی' مگر ڈرائیونگ ہم نہیں' عطا کر رہا تھا۔ ہماری منت سماجت اور لعنت ملامت کے باوجود اس نے سوئی کو ۱۴۰ کلو میٹر فی گھنٹہ سے نیچے نہ آنے دیا اور یوں ہم اپنے اندازے سے بہت پہلے اسلام آباد کے سیکٹر F-8-2 میں عطا کے چھوٹے سے خوبصورت مکان میں جا اترے۔

اگلے دن اسلام آباد اور راولپنڈی میں مختلف دوستوں سے ملتے ملاتے رہے۔ دوپہر ڈھلنے لگی تو ہمارے تیسرے ساتھی نے دوپہر کے کھانے کی فرمائش کی۔ عطا نے ہنس کر کہا" بھائی میں غریب آدمی ہوں۔ مانگ تانگ کر کھالیتا ہوں۔ اپنی جیب سے تو تمہیں کچھ کھلا نہیں سکتا۔ البتہ ـــــ چلو کسی کے در پر صدا لگاتے ہیں' کوئی اللہ کا بندہ کچھ نہ کچھ دے ہی دے گا۔

قریب ہی کیسٹوں کی ایک فیشن ایبل دوکان تھی۔ عطا ہمیں ساتھ لے کر اس دکان میں داخل ہوا تو دکان کا مالک بسم اللہ' بسم اللہ کہتا اس سے لپٹ گیا۔

" فرمایئے! کیا حکم ہے میرے لئے؟ " اس نے علیک سلیک سے فارغ ہو کر کہا۔

" کھانا کھانا ہے۔" عطا نے نہایت سادگی سے کہا۔

چند ہی منٹ بعد ہم مرغ مسلم' سیخ کباب اور نہ جانے کیا کیا کچھ نوش جان کر رہے تھے۔

باتوں باتوں میں عطا نے دکان کے مالک سے پوچھا: " میرے کیسٹ والیوم ۲۹ کے کتنے کارٹن (ڈبے) آپ کو ملے ہیں؟ "

" کل دو سو کیسٹ آئے ہیں سرکار " اس نے جواب دیا " مگر میرا کام پہلے ہی بن گیا تھا۔ اس کیسٹ میں وہ گانا ہے نا " بچی دس وے ڈھولا' کل کیوں نئیں آیا " ـــــ اس کی اصل ریکارڈنگ میں ٹیلی ویژن سے لے آیا تھا۔ تقریباً ۷۰۰ کیسٹ پہلے ہی فروخت کر چکا